www.cpsglobal.org

الرسالہ

Al-Risala

September 2011 • No. 418

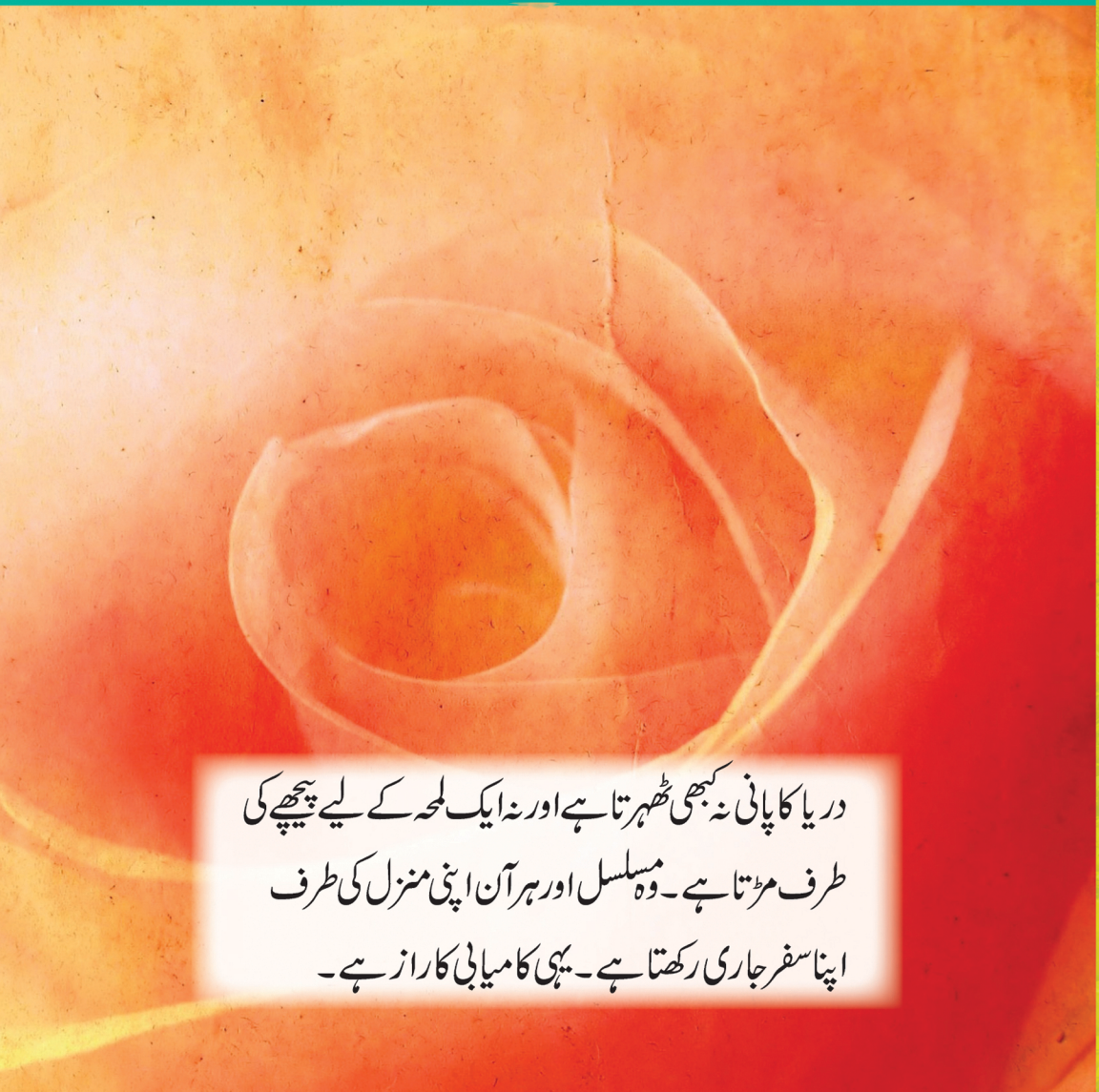

دریا کا پانی نہ کبھی ٹھہرتا ہے اور نہ ایک لمحہ کے لیے پیچھے کی طرف مڑتا ہے۔ وہ مسلسل اور ہر آن اپنی منزل کی طرف اپنا سفر جاری رکھتا ہے۔ یہی کامیابی کا راز ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

جاری کردہ 1976

اردو اور انگریزی میں شائع ہونے والا

اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی

مولانا وحید الدین خاں

صدر اسلامی مرکز

Al-Risala Monthly
1, Nizamuddin West Market
New Delhi-110 013
Tel. 2435 6666, 2435 5454
46521511, Fax: 45651771
email: info@goodwordbooks.com
www.goodwordbooks.com

Subscription Rates
Single copy ₹10
One year ₹100
Two years ₹200
Three years ₹300

Abroad by Air Mail. One year $20

Printed and published by
Saniyasnain Khan on behalf of
Al-Markazul Islami, New Delhi

Printed at Nice Printing Press
7/10, Parwana Road
Khureji Khas, Delhi-110 051

ستمبر 2011

فہرست

محبتِ الٰہی	2	خدا کی عظمت	14
ایمان اور عملِ صالح	3	شخصیت کی تعمیر	16
محبتِ الٰہی کا سرچشمہ	4	بڑھاپے کی عمر	18
مصلح کی ایذا رسانی	5	انسانی تاریخ کے چار دور	19
حرصِ جنت، خوفِ جہنم	6	کیا قیامت قریب ہے	31
جنت: عطیۂ خداوندی	7	تعلق باللہ	35
نجاتِ آخرت	8	ایک غیر دانش مندانہ روش	36
عافیت کی زندگی	9	گھر کی الٹی تربیت	37
محبتِ الٰہی، اعترافِ الٰہی	10	زندگی کا سفر	38
محبتِ الٰہی، عشقِ الٰہی	11	آخری انجام	40
محبتِ الٰہی، اطاعتِ الٰہی	12	سوال و جواب	41
اللہ ہمارے دلوں میں	13	خبر نامہ اسلامی مرکز	45

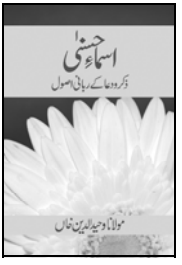

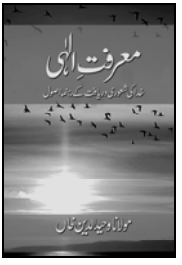

محبتِ الٰہی

قرآن میں اہلِ ایمان کی ایک بنیادی صفت اِن الفاظ میں بتائی گئی ہے: والذین اٰمنوا أشدّ حبًّا للہ (2:165) یعنی جو لوگ خدا پر ایمان رکھتے ہیں، وہ سب سے زیادہ خدا سے محبت رکھنے والے ہیں۔ قرآن کی اِس آیت میں اہلِ ایمان سے مراد اہلِ معرفت ہیں۔ جو شخص دریافت کے درجے میں خدا کو پائے، وہ ایک صاحبِ معرفت انسان بن جاتا ہے، اور جو انسان صاحب معرفت ہو، اس کے جذبات تمام تر خدا کے ساتھ وابستہ ہو جائیں گے۔ خدا اس کے قلب و دماغ کا واحد مرکز بن جائے گا۔

انسان اپنی محدودیت کی بنا پر موجودہ دنیا میں خدا کو نہیں دیکھتا، لیکن وہ خدا کی رحمتوں کا ہر آن تجربہ کرتا ہے، اور یہی تجربہ محبتِ الٰہی کا اصل سرچشمہ ہے۔ آدمی کو اِس دنیا میں جو کچھ ملا ہوا، وہ سب کا سب خدا کی رحمت ہے۔ آدمی جتنا زیادہ اِن ملی ہوئی چیزوں پر غور کرے گا، اتنا ہی زیادہ خدا کے ساتھ اس کی محبت بڑھتی چلی جائے گی۔ خدا سے محبت کا سرچشمہ انعام کی دریافت ہے، نہ کہ منعم کا مشاہدہ۔

انسان کو کس نے پیدا کیا، خدا نے۔ انسان کو مختلف قسم کی اعلیٰ صلاحیتیں کس نے دیں، خدا نے۔ انسان کے لیے زمین جیسا ایک استثنائی سیارہ کس نے بنایا، خدا نے۔ انسان کے لیے یہاں لائف سپورٹ سسٹم کس نے قائم کیا، خدا نے۔ انسان کی تمام حاجتوں کی تکمیل کا انتظام کس نے کیا، خدا نے۔ انسان کو وہ دماغ کس نے دیا جو زمین پر رہتے ہوئے ساری کائنات کا احاطہ کر سکتا ہے، خدا نے۔

اِنھیں تمام انعام کے منعم کی دریافت کا نام معرفت ہے۔ کسی انسان کو جب یہ معرفت حقیقی معنوں میں حاصل ہو جائے تو اس کے اندر خدا سے محبت کا سرچشمہ ابل پڑتا ہے۔ اس کے دل کی گہرائیاں خدا کی محبت سے روشن ہو جاتی ہیں۔ خدا کی اطاعت بلاشبہہ ایمان کا تقاضا ہے، لیکن یہ خدا سے محبت کی تصغیر ہے کہ اُس کو صرف اطاعت کے معنی میں لیا جائے۔ اطاعت، خدا سے تعلق کا صرف ایک قانونی اظہار ہے، جب کہ محبت کا مطلب یہ ہے کہ انسان کا پورا وجود خدا کی یاد میں ڈھل گیا، انسان اپنی پوری ہستی کے ساتھ خدا کا اعترافِ کامل کرنے والا بن گیا۔

ایمان اور عملِ صالح

آخرت کی کامیابی کے لیے دو چیزیں ضروری ہیں— ایمان اور عملِ صالح۔ چناں چہ قرآن میں تقریباً 60 بار یہ الفاظ آئے ہیں: **الذین آمنوا وعملوا الصالحات** یعنی جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے عمل صالح کیا (وہ جنت میں داخل کئے جائیں گے)۔

ایمان باللہ کیا ہے۔ ایمان باللہ فقہی اعتبار سے یہ ہے کہ آدمی اپنی زبان سے یہ کہے کہ: **آمنتُ باللہ** (میں اللہ پر ایمان لایا)۔ لیکن یہ کہنا صرف زبان سے کچھ الفاظ بولنے کا نام نہیں ہے، بلکہ وہ معرفت (realization) کے بعد اس کے شعوری اظہار کا نام ہے۔ جب آدمی اللہ کے بارے میں سوچتا ہے اور ہدایت کی دعا کرتا ہے تو اُس وقت وہ لمحہ آتا ہے جب کہ اس پر حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ میں نے اللہ کو دریافت کرلیا۔ اُس وقت جب اس کی دریافت لفظوں میں ڈھلتی ہے تو اسی کا نام ایمان باللہ ہے۔

عمل صالح کا لفظی ترجمہ نیک عمل ہے، لیکن اپنی حقیقت کے اعتبار سے عملِ صالح یہ ہے کہ آدمی کی داخلی دریافت خارجی عمل کی صورت اختیار کرلے، یعنی ایمان کے مطابق عمل۔ جس سچائی کو اس نے ذہنی طور پر پایا ہے، وہ سچائی عملی طور (practically) پر اس کی زندگی میں شامل ہوجائے۔ ایمان اور عمل صالح ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔ داخلی اعتبار سے اس کا نام ایمان باللہ ہے اور خارجی اعتبار سے اس کا نام عمل صالح۔

ایمان اور عملِ صالح بظاہر دو الگ الگ الفاظ ہیں، لیکن حقیقت کے اعتبار سے دونوں ایک ہی واقعہ کے دو پہلو ہیں، دونوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ جہاں حقیقی ایمان ہوگا، وہاں عملِ صالح بھی ضرور پایا جائے گا۔ اور جہاں حقیقی عملِ صالح ہوگا، وہاں ایمان بھی ضرور موجود ہوگا۔ الفاظ کے اعتبار سے بظاہر دونوں الگ الگ ہیں، لیکن حقیقت کے اعتبار سے دونوں کے درمیان کوئی فرق موجود نہیں۔

محبتِ الٰہی کا سرچشمہ

قرآن کی سورہ النحل میں ارشاد ہوا ہے: **واشکروا نعمة الله إن كنتم إيّاه تعبدون** (16: 114) یعنی تم اللہ کی نعمت کا شکر ادا کرو، اگر تم اللہ ہی کی عبادت کرنے والے ہو۔ اللہ کی نعمت کا شکر ادا کرنا کوئی سادہ بات نہیں، اِس میں اللہ سے محبت اپنے آپ شامل ہے۔ نعمتوں کا احساس، آدمی کے اندر اس کے دینے والے کے لیے محبت پیدا کرتا ہے۔ اس کے بعد آدمی کی زبان سے شکر، یعنی اعتراف (acknowledgement) کا کلمہ نکلتا ہے۔ گویا کہ انعام سے، منعم کے لیے محبت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور محبت، اعتراف کے کلمات میں ڈھل جاتی ہے۔ اِسی کو شکر کہا گیا ہے۔

اِسی حقیقت کو ایک حدیث رسول میں اِس طرح بیان کیا گیا ہے: **أحبوا الله لما يغذوكم به من نِعَمه** (المستدرك للحاكم، رقم الحديث: 4716) یعنی تم اللہ سے محبت کرو اُس کی اُن نعمتوں کی بنا پر جن نعمتوں کا رزق اللہ نے تم کو عطا فرمایا ہے۔

اِس روایت میں 'غذا' کا لفظ علامتی معنوں میں ہے۔ یہاں غذا سے مراد ہر قسم کے عطیات ہیں جو اللہ کی طرف سے انسان کو ملے ہیں۔ اِس میں مادّی عطیات (material blessings) بھی شامل ہیں، اور معنوی عطیات (spiritual blessings) بھی۔

قرآن کی مذکورہ آیت اور مذکورہ حدیث رسول پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ احساسِ محبت کا سرچشمہ احساسِ نعمت ہے۔ موجودہ دنیا میں انسان کو جو بھی چھوٹی یا بڑی چیز ملی ہے، وہ سب کی سب، اللہ کی طرف سے یک طرفہ انعام کے طور پر ملی ہے۔ انسان اپنے بارے میں اور خارجی دنیا کے بارے میں جتنا زیادہ سوچے گا، اتنا ہی زیادہ وہ اللہ کی نعمتوں کو دریافت کرے گا۔

انسان جب شعوری طور پر اِن خدائی نعمتوں کو دریافت کرتا ہے تو اُس کا فطری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی کے اندر دینے والے کے لیے محبت کے گہرے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں، پھر یہی محبت ذکر اور شکر اور عبادت کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔

مصلح کی ایذا رسانی

قرآن کی سورہ الاحزاب میں یہ آیت آئی ہے: **یا أیھا الذین آمنوا لا تکونوا کالذین آذوا موسیٰ فبرأہ اللہ مما قالوا، وکان عند اللہ وجیھاً** (33:69) یعنی اے ایمان والو، تم اُن لوگوں کے مانند نہ بنو جنھوں نے موسیٰ کو ستایا، تو اللہ نے موسیٰ کو ان لوگوں کی تہمتوں سے بری کر دیا اور موسیٰ اللہ کے نزدیک بہت باوقار تھا۔

قرآن کی اِس آیت میں دراصل یہ بتایا گیا ہے کہ کوئی امت جب اپنے دورِ زوال میں پہنچتی ہے تو اس کا کیا حال ہوتا ہے۔ زوال یافتہ نفسیات (degenerated psychology) کی بنا پر ایسے لوگ اپنے خلاف نصیحت اور تنقید کو پسند نہیں کرتے۔ چناں چہ ایسی حالت میں جو اللہ کا بندہ اُن کے درمیان کھڑا ہو کر ان کی کمزوریوں کی نشان دہی کرتا ہے، وہ اس کے دشمن بن جاتے ہیں اور جھوٹے الزام لگا کر اس کو بدنام کرتے ہیں، تاکہ یہ ظاہر ہو کہ خرابی لوگوں کے اندر نہیں ہے، بلکہ خود مصلح کے اندر ہے۔ اِسی نفسیات کے تحت، یہود نے اپنے دورِ زوال میں حضرت موسیٰ کے خلاف بہت سے قصے گھڑے تھے جو اب بھی کتابوں میں موجود ہیں۔

قرآن کی اِس آیت کا خطاب دراصل امتِ محمدی کی طرف ہے۔ اِس آیت میں امتِ محمدی کو یہ انتباہ دیا گیا ہے کہ تم پر بھی زوال آئے گا۔ اُس وقت تم ایسا نہ کرنا کہ تم اپنے مُصلح کو قبول نہ کرو اور اپنے عدمِ قبولیت کے جواز (justification) کے لیے ایسا کرو کہ اپنے مصلح کے خلاف جھوٹے الزامات لگا کر اس کو بدنام کرو اور اس طرح یہ ظاہر کرو کہ غلطی تمھاری طرف نہیں ہے، بلکہ مصلح کی طرف ہے۔ یہ سخت گناہ کا فعل ہے۔ جو لوگ ایسا کریں، اُن کو اُسی طرح پکڑا جائے گا جس طرح حضرت موسیٰ کے معاصر یہود کو پکڑا گیا۔ قرآن کی اِس آیت میں مصلح کے لیے ایک عظیم خوش خبری ہے، وہ یہ کہ مخالفین کی طرف سے الزام تراشی کی مہم یقینی طور پر ناکام ہوگی، اور آخر کار مصلح کا برسرِ حق ہونا ایک ثابت شدہ واقعہ بن جائے گا، موجودہ دنیا میں بھی اور آخرت کی دنیا میں بھی۔

حرصِ جنت، خوفِ جہنم

ایک روایت حدیث کی مختلف کتابوں میں آئی ہے۔ سنن الترمذی کے الفاظ یہ ہیں: **عن أنس بن مالك قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من سأل الله الجنّة ثلاث مرات، قال الجنة: اللهم أدخله الجنة. ومن استجار من النار ثلاث مرات، قالت النار: اللّٰهم أجره من النار (الترمذي، رقم الحديث: 2572؛ أخرجه أيضاً النسائي وابن ماجه وابن حبّان في صحيحه والحاكم)** ۔یعنی جس نے اللہ سے جنت مانگی تین بار، جنت کہے گی کہ اے اللہ، تو اس کو جنت میں داخل کردے۔ اور جس شخص نے جہنم سے پناہ مانگی تین بار، جہنم کہے گی کہ اے اللہ، تو اس کو جہنم سے پناہ دے دے۔

اِس حدیثِ رسول میں تین بار سے مراد تین گنتی نہیں ہے، بلکہ تین موقع (occasion) ہے۔ اِس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جو شخص گنتی کے اعتبار سے، اِن الفاظ کو تین بار بول دے، وہ اِس انعام کا مستحق بن جائے گا۔ اِس سے مراد دراصل وہ انسان ہے جس نے جنت اور جہنم کو دریافت کیا، جنت اور جہنم کی سوچ جس کے تفکیری عمل (thinking process) میں شامل ہوگئی۔ جو جنت کا سب سے زیادہ حریص بن گیا اور جہنم سے سب سے زیادہ ڈرنے لگا۔ بڑھے ہوئے شعور کی بنا پر جس کا یہ حال ہو گیا کہ وہ سوچنے لگا کہ اگر جنت نہ ملی تو میرا کیا حال ہوگا، اور اگر مجھ کو جہنم میں ڈال دیا گیا تو میں کیسے اس کا تحمل کروں گا۔ پھر اُس کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا کہ فرشتوں کے ریکارڈ میں کم از کم تین بار یہ واقعہ درج ہوا کہ وہ جنت اور جہنم کی یاد میں تڑپ رہا ہے اور اپنی تنہائیوں میں خدا کو پکارتے ہوئے وہ یہ کہہ رہا ہے کہ — خدایا، تو مجھ کو اپنے اُن بندوں میں شامل فرما جن کو تو جنت کا انعام عطا فرمائے گا، خدایا، تو مجھ کو اپنے اُن بندوں میں شامل فرما جن کو تو جہنم کی آگ سے نجات دے گا۔ جس انسان کے اوپر کم از کم تین بار یہ طوفانی تجربہ گزرا، وہ مذکورہ حدیثِ رسول کا مصداق قرار پائے گا۔ اس حدیث رسول میں دراصل ایک حقیقتِ واقعہ کو بیان کیا گیا ہے، نہ کہ کسی قسم کی لفظی گنتی کو۔

جنت: عطیۂ خداوندی

تمام حیوانات اپنی ضرورت کے مقام پر چل کر یا رینگ کر پہنچتے ہیں۔ مگر اس میں صرف ایک استثنا ہے اور وہ مچھلی کا استثنا ہے۔ مچھلی پانی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی، مگر مچھلی کے اندر یہ طاقت نہیں کہ وہ رینگ کر یا چل کر پانی میں پہنچ جائے۔ وہ دریا کے کنارے تڑپتی رہے گی، لیکن خود سے وہ دریا کے اندر نہ جاسکے گی، الا یہ کہ کوئی شخص اس کو اٹھا کر پانی میں ڈال دے۔

یہ واقعہ تمثیل کی زبان میں ایک حقیقت کو بتاتا ہے، اور وہ جنت کا معاملہ ہے۔ کوئی شخص کتنا ہی زیادہ صالح اور متقی ہو، مگر اس کا ذاتی عمل اس کو جنت میں نہیں پہنچا سکتا۔ کسی شخص کا جنت میں پہنچنا صرف اُسی وقت ممکن ہے جب کہ اللہ اپنی رحمت کے ذریعے اس کو جنت میں داخل کردے۔ یہی وہ حقیقت ہے جو ایک حدیث میں اِن الفاظ میں بیان کی گئی ہے: **إنّه لا يدخل أحداً الجنة عمله. قالوا: ولا أنت يا رسول الله، قال: ولا أنا، إلا أن يتغمّدني اللّٰه بمغفرة ورحمة (صحيح البخاري، كتاب الرقاق، باب القصد)** یعنی بے شک کسی آدمی کا عمل اُس کو جنت میں داخل نہیں کرے گا۔ صحابہ نے کہا، اے خدا کے رسول، کیا آپ بھی۔ آپ نے فرمایا ہاں، الا یہ کہ اللہ مجھے اپنی مغفرت اور رحمت سے ڈھانک لے۔

حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی انسانی عمل جنت کی قیمت نہیں۔ انسانی عمل صرف اِس لیے ہے کہ وہ اللہ کی رحمت کو اپنی طرف متوجہ کرسکے۔ اِسی لیے انسانی عمل میں سب سے بڑی چیز معرفتِ الٰہی ہے۔ معرفتِ الٰہی میں جو شخص پورا اترے گا، اللہ اس کی طرف متوجہ ہوگا اور اپنی عنایتِ خاص کے تحت اس کے لیے جنت میں داخلے کا فیصلہ فرمائے گا۔ جنت کسی کو اللہ کی عنایت سے ملے گی، نہ کہ اپنے عمل کی قیمت کے طور پر۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کا چند سالہ عمل کبھی ابدی جنت کے برابر نہیں ہوسکتا۔ کوئی شخص جو اپنے عمل کو جنت کی قیمت سمجھے، اُس کا معاملہ آخرت میں اُس شخص جیسا ہوگا جس کے پاس صرف ایک پیسہ ہو اور وہ ہوائی جہاز خریدنے کے لیے پہنچ جائے۔

نجاتِ آخرت

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی صاحب زادی فاطمہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: **يا فاطمة، أنقذي نفسك من النّار، فإني لا أملك لكم من الله شيئاً (صحيح مسلم، كتاب الإيمان، باب في قوله تعالىٰ وأنذر عشيرتك الأقربين)** یعنی اے فاطمہ، اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچاؤ۔ کیوں کہ میں اللہ کے مقابلے میں تمھارے لیے کچھ کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ اسی طرح حضرت عائشہ کی ایک روایت کے مطابق، آپ نے فرمایا کہ کسی شخص کا کوئی عمل اُس کو جنت میں نہیں لے جائے گا، حتی کہ مجھے بھی نہیں۔ میرے لیے بھی صرف اللہ کی مغفرت اور رحمت سے جنت میں پہنچنا ممکن ہوگا **(صحيح البخاری، كتاب الرقاق، باب القصد والمداومة على العمل)**

آخرت میں جنت کا ملنا کسی انسان کے لیے آخری کامیابی کا معاملہ ہوگا۔ یہ عظیم واقعہ صرف خدا کے فیصلے کے تحت انجام پائے گا۔ جنت میں داخلہ کوئی سادہ معاملہ نہیں۔ یہ خدا کی قدرتِ کاملہ کا اظہار ہے۔ جنت صرف معترفین کے لیے ہے، یعنی اُن لوگوں کے لیے جو کامل اعتراف کے ساتھ جنت میں داخل ہوں۔ یہ کامل اعتراف حقیقی اعتراف ہوگا، نہ کہ صرف لفظی اعتراف۔

اعترافِ کامل کا یہ احساس کسی انسان کے اندر صرف اُس وقت پیدا ہوگا جب کہ وہ فی الواقع یہ محسوس کرے کہ جنت مجھے صرف فضلِ خداوندی کی بنا پر مل سکتی ہے۔ جو یہ کہہ سکے کہ خدایا، میں کامل طور پر غیر مستحق تھا۔ یہ صرف تیری غیر معمولی عنایت ہے کہ تو نے میرے عدم استحقاق کے باوجود محض اپنے فضل سے مجھے جنت دے دی۔

حقیقت یہ ہے کہ جنت اتنی عظیم ہے کہ کوئی بھی عمل یا تمام انسانوں کا مجموعی عمل بھی اس کی قیمت نہیں بن سکتا۔ جو آدمی جنت کو اِس طرح دریافت کرلے کہ جنت کی ابدی نعمتوں کے مقابلے میں وہ اپنے آپ کو کامل طور پر غیر مستحق سمجھنے لگے، وہی جنت میں داخل ہوگا۔ انسان کا کوئی عمل جنت میں داخلے کا ٹکٹ نہیں بن سکتا۔ جنت میں داخلے کا ٹکٹ یہ ہے کہ آدمی اپنے غیر مستحق ہونے کو دریافت کرلے۔

عافیت کی زندگی

عبداللہ بن عمر سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **مَن فُتح لـه منكم بابُ الدعاء، فتحت له أبواب الرّحمة. وما سُئل الله شيئاً يعني أحبَّ إليه من أن يسأل العافية (رواه الترمذي، بحواله مشكاة المصابيح، رقم الحديث: 2339)** یعنی تم میں سے جس کے لیے دعا کا دروازہ کھولا جائے، اُس کے لیے رحمت کے تمام دروازے کھول دئے گئے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب دعا یہ ہے کہ بندہ اُس سے عافیت مانگے۔

دعا دراصل اللہ کے مقابلے میں اپنے عجز کا اظہار ہے۔ عجز کا اظہار ہمیشہ اللہ کی عظمت کے کامل اعتراف سے پیدا ہوتا ہے۔ جو آدمی اللہ کی عظمت کو دریافت کرے، اُس کے نتیجے میں اس کے اندر اپنے بارے میں کامل عجز (total helplessness) کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ عجز کا احساس جب لفظوں میں ڈھل جائے تو اِسی کا نام دعا ہے۔

عافیت کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں آدمی کو صحت اور سکون کی زندگی حاصل ہو جائے۔ دنیا کی زندگی میں صحت اور سکون بلاشبہہ سب سے بڑی نعمت کی حیثیت رکھتی ہے۔ کوئی بھی کام کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی کو اِس قسم کی عافیت حاصل ہو۔ عافیت کا حصول انسان کے اپنے بس میں نہیں۔ جس طرح زندگی اللہ کی طرف سے ملتی ہے، اِسی طرح عافیت بھی اللہ کی طرف سے ملتی ہے۔ عافیت کی اِسی اہمیت کا تقاضا ہے کہ آدمی ہر وقت خدا سے عافیت کی دعا کرتا رہے۔

عافیت کا تعلق دولت (wealth) یا مادی سامانِ راحت سے نہیں ہے، عافیت کا تعلق تمام تر ذہنی سکون سے ہے۔ یہ ذہنی سکون کسی انسان کو اللہ کی خصوصی توفیق سے ملتا ہے۔ کوئی انسان ذکر اور دعا اور عبادت اور معرفت کا ثبوت اُسی وقت دے سکتا ہے جب کہ اس کو عافیت کی زندگی حاصل ہو جائے۔ ایسی حالت میں یہ کہنا درست ہوگا کہ — اللہ سے مانگنے کی سب سے بڑی چیز عافیت ہے، نہ کہ دولت یا مادی سامانِ راحت۔

محبتِ الٰہی، اعترافِ الٰہی

اللہ سے محبت ایمان کا جز ہے۔ اللہ سے محبت تمام الہامی مذاہب کی تعلیمات کا حصہ رہا ہے۔ مثلاً موجودہ بائبل، عہد نامہ قدیم اور عہد نامہ جدید، دونوں میں آیا ہے کہ — خداوند اپنے خدا سے، اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری عقل سے محبت رکھ:

You shall love the Lord your God with all your heart, with all your soul and with all your mind. (Matthew 22: 37, Deuteronomy 6: 5)

محبتِ الٰہی کسی پُر اسرار چیز کا نام نہیں۔ محبتِ الٰہی دراصل اعترافِ الٰہی کا اعلیٰ درجہ ہے۔ ایک شخص جب اللہ کی دریافت کرتا ہے، جب وہ اللہ کی نعمتوں سے شعوری طور پر واقف ہوتا ہے، جب وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کا وجود اور اس کی پوری زندگی اللہ کے انعامات (blessings) سے بھری ہوئی ہے، اُس وقت فطری طور پر اُس کے اندر اللہ کے لیے شدید محبت (strong affection) کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اِسی حبِّ شدید کا نام محبتِ الٰہی ہے۔

محبتِ الٰہی، رب السماوات والارض سے محبت کا نام ہے۔ ایسی محبت کسی آدمی کے لیے صرف جذباتی تعلق کا نام نہیں ہوتا، اِس کے ذریعے آدمی کی شخصیت میں ایک انقلاب پیدا ہو جاتا ہے۔ محبتِ الٰہی آدمی کے اندر تمام اعلیٰ صفات پیدا کرتی ہے۔ مثلاً مثبت سوچ (positive thinking)، انسانوں کے لیے شفقت، توکل اور اعتماد اور حوصلہ، وغیرہ۔

محبت اللہ کی نسبت سے، معرفت کا اعلیٰ درجہ ہے۔ انسان کی نسبت سے معرفت آدمی کے اندر انسان دوست کردار (human-friendly behaviour) پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ دعوت الی اللہ بھی محبت الٰہی کا ایک اظہار ہے۔ جب کسی انسان کو اللہ سے محبت کا تعلق قائم ہوتا ہے تو فطری طور پر وہ چاہنے لگتا ہے کہ وہ اللہ کے بندوں تک اللہ کا پیغام پہنچائے، یہاں تک کہ اللہ کا کوئی بندہ اپنے رب کی ابدی رحمتوں سے محروم نہ رہے۔

محبتِ الٰہی، عشقِ الٰہی

قرآن اور حدیث میں اللہ کے لیے محبت کا ذکر ہے، لیکن قرآن اور حدیث میں اللہ کے لیے عشق کا ذکر نہیں۔ عشقِ الٰہی کا تصور بعد کو عباسی دور میں، صوفیا کے یہاں پیدا ہوا۔ یہ دراصل غلو (extremism) کا ظاہرہ (phenomenon) ہے۔ صوفیا نے بر بناءِ غلو یہ نظریہ قائم کیا کہ خدا کے لیے عبادت سرتاسر بے غرض ہونا چاہیے، جنت کی حرص یا جہنم کے خوف سے نہیں۔ اِسی سے صوفیانہ نظریے کی بنا پر عشق کا تصور پیدا ہوا۔ عشق دراصل محبت برائے محبت (love for the sake of love) کا نام ہے۔ عشق کے اِس تصور کا ماخذ خود صوفیا کا اپنا تصورِ عبادت تھا، نہ کہ اسلام کا تصورِ عبادت۔

اللہ سے محبت اسلام میں اعلیٰ ترین مطلوب چیز ہے۔ یہ محبت ذاتِ خداوندی سے عاشقانہ تعلق کی بنا پر نہیں ہوتی۔ اسلام کا تصورِ محبت تمام تر انعاماتِ الٰہی (divine blessings) کی بنیاد پر قائم ہے۔ انسان موجودہ دنیا میں خدا کے بے شمار انعامات کا تجربہ کرتا ہے۔ یہ انعامات آدمی کے اندر منعم (giver) کے لیے گہرا قلبی تعلق پیدا کر دیتے ہیں۔ اِسی گہرے قلبی تعلق کا نام محبتِ الٰہی ہے۔

عشق گویا کہ فزیکل لَو (physical love) کا نام ہے، اور اِس کے مقابلے میں، محبت گویا کہ اسپریچول لو (spiritual love) کا نام۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان، خدا کو اس کے انعامات کے واسطے سے دریافت کرتا ہے۔ انعام کی یہ دریافت (discovery) فطری طور پر آدمی کے اندر منعم کے لیے اعتراف (acknowledgement) کا ذہن پیدا کرتی ہے۔

عبادتِ الٰہی کی اصل یہی اعتراف (acknowledgement) ہے۔ حمد اور شکر اور ذکر جیسے الفاظ اصلاً اپنی حقیقت کے اعتبار سے، اِسی اعتراف کے مختلف نام ہیں۔ اِس اعتراف میں جب والہانہ قلبی جذبات شامل ہو جائیں تو اِسی کا نام محبت ہے۔

محبت فطری محبت کا نام ہے، اور عشق غلو آمیز محبت کا نام، اور قرآن اور حدیث کے واضح نصوص کے مطابق، غلو اسلام میں نہیں (لا غلوَّ في الإسلام)۔

محبتِ الٰہی، اطاعتِ الٰہی

کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ — اللہ سے محبت کا مطلب اللہ کی اطاعت ہے۔ اِس کا سبب وہ یہ بتاتے ہیں کہ اللہ کی ذات ایک غیر مرئی ذات (invisible being) ہے، اور ایک غیر مرئی ذات سے محبت جیسا جذباتی تعلق (emotional attachment) پیدا نہیں ہوسکتا، اُس کی صرف اطاعت ہی کی جاسکتی ہے۔ یہ اطاعت بواسطۂ احکام ہوگی جو ہم کو قرآن اور حدیث کے ذریعے معلوم ہوئے ہیں۔

یہ بات صحیح نہیں۔ کیوں کہ جو بات اللہ سے محبت کے بارے میں کہی جاتی ہے، وہی بات اللہ پر ایمان سے بھی تعلق رکھتی ہے۔ اللہ پر ایمان اگر یؤمنون بالغیب کی صورت میں ہوسکتا ہے، تو اللہ سے محبت بھی یحبون بالغیب کی صورت میں یقینی طور پر ممکن ہے۔

اصل یہ ہے کہ ایمان کا معاملہ ہو یا محبت کا معاملہ، دونوں اللہ کی نسبت سے مطلوب ہیں، نہ کہ کسی عام نسبت سے۔ ایمان کا مطلب عقیدہ ہے۔ عقیدہ کا لفظ ایک مرئی چیز (visible entity) کے لیے بھی بولا جاسکتا ہے۔ اُس وقت عقیدہ اپنے عام لغوی مفہوم میں ہوگا۔ لیکن جب عقیدہ کا لفظ اللہ کے لیے بولا جائے تو وہ نسبت کے بدلنے کی وجہ سے مافوق عقیدہ (high belief) کے معنی میں ہوگا۔ اِسی طرح، محبت کا لفظ جب اللہ کی نسبت سے استعمال کیا جائے تو وہ مافوق محبت (high love) کے ہم معنی ہوجائے گا۔

انسانی نفسیات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ کسی سے انسان کا جذباتی تعلق حقیقتاً دیکھ کر قائم نہیں ہوسکتا، بلکہ وہ فکر کے ذریعے تصوراتی سطح (conceptual level) پر قائم ہوتا ہے۔ خواہ بظاہر وہ کوئی مرئی چیز ہو یا غیر مرئی چیز، اُس سے انسان کا تعلق ہمیشہ تصوراتی سوچ کے ذریعے قائم ہوتا ہے۔

انسان کی نفسیات کے اعتبار سے، عقیدہ تصوراتی عقیدہ (conceptual belief) کا نام ہے۔ تصوراتی سطح پر ہی کسی انسان کو اللہ کی معرفت (realization of God) حاصل ہوتی ہے، تصوراتی سطح پر ہی کوئی انسان اللہ سے محبت کرنے والا بنتا ہے، نہ کہ مشاہداتی سطح پر۔

اللہ ہمارے دلوں میں

مولانا عبدالباسط عمری قطر میں رہتے ہیں۔ وہ ہمارے دعوتی مشن سے وابستہ ہیں۔ وہ سی پی ایس (نئی دہلی) میں ہونے والے ہفتے وار لیکچر کو بذریعہ انٹرنیٹ پابندی کے ساتھ سنتے ہیں۔ انھوں نے ہمارے ساتھی مولانا محمد ذکوان ندوی کو ٹیلی فون پر اپنا ایک تاثر بتایا۔ یہ تاثر اُنھیں کے الفاظ میں یہاں نقل کیا جاتا ہے:

''عرب امارات کے حاکم وبانی شیخ زائد بن سلطان آلِ نہیان کا 2004 میں انتقال ہوا۔ اُس وقت عربی ریڈیو میں شیخ زائد کے اوپر ایک پروگرام آتا تھا۔ اِس پروگرام کا عنوان تھا: زائد في قلوبنا (شیخ زائد ہمارے دلوں میں)۔ اِس پروگرام میں لوگ شیخ زائد کی شخصیت اور ان کے کارناموں کو بیان کرتے تھے۔ بعض لوگ اپنے تاثرات بیان کرتے وقت رونے لگتے تھے۔ اِس واقعے کو لے کر اب میں سوچتا ہوں کہ اِس دنیا میں ایسا کوئی شخص نظر نہیں آتا جو یہ کہے کہ — اللہ ہمارے دلوں میں ہے۔ کوئی پروگرام ایسا دکھائی نہیں دیتا جس کا عنوان ہو: الله في قلوبنا (اللہ ہمارے دلوں میں)۔ لوگ اِس پروگرام میں خدا کی نعمتوں کا اور اللہ کی عظمتوں کا چرچا کریں اور اللہ سے اپنی محبت کا اظہار کریں''۔

مومن وہ ہے جو اللہ رب العالمین کو اُس کی عظمتوں کے ساتھ دریافت کرے۔ جو شخص اللہ رب العالمین کو اِس طرح اس کی عظمت اور قدرت کے ساتھ دریافت کرے گا، اس کا دل اللہ کی بڑائی سے بھر جائے گا۔ وہ اللہ کی بڑائی میں جینے لگے گا۔ اللہ اس کے دل کا سب سے بڑا سرمایہ بن جائے گا۔ کائنات کی ہر چیز اُس کو اللہ کی یاد دلانے والی بن جائے گی۔ وہ سورج اور چاند میں اللہ کا جلوہ دیکھے گا۔ وہ پہاڑوں اور سمندروں میں آلاء اللہ (wonders of God) کا مشاہدہ کرے گا۔ انسان کی زندگی اور انسان کی موت بھی اس کو اللہ کی یاد دلانے والی بن جائے گی۔

جو اہلِ ایمان اِس طرح اللہ کی عظمتوں میں جینے والے بن جائیں، اُن کا حال یہ ہوگا کہ اُن کی زندگی اللہ کے رنگ میں رنگ جائے گی۔ وہ بولیں گے تو اُن کے بول اللہ کی عظمت والے بول ہوں گے۔ وہ لکھیں گے تو اُن کی تحریر اللہ کی عظمت کے تعارف کے ہم معنیٰ ہوگی۔

خدا کی عظمت

خدا کی معرفت ایمان اور اسلام کی اساس (basis) ہے۔ جتنی اعلیٰ معرفت، اتنا ہی اعلیٰ ایمان۔ اِس معرفت کی تکمیل اُس وقت ہوتی ہے، جب کہ آپ خدا کو اس کے کمالِ عظمت کے ساتھ دریافت کریں۔ ایک بندہ جب خدا کو اس کی عظمتوں کے ساتھ دریافت کرتا ہے تو اس کا وہی حال ہوتا ہے جس کو قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: الذین إذا ذکر اللّٰہ وجلت قلوبھم (8:2) یعنی خدا کی یاد سے اُن کے دل دہل اٹھتے ہیں۔ جدید فلکیاتی سائنس (modern astronomy) کا اِس معاملے میں ایک مثبت کنٹری بیوشن (contribution) یہ ہے کہ اس نے خالق کی ناقابلِ قیاس عظمت کا ادراک کرنے کے لیے ایک فریم ورک (frame work) دے دیا ہے۔ اِس فریم ورک کی مدد سے انسان خداوند ذوالجلال کی ناقابلِ بیان عظمت کا ایک تصور اپنے ذہن میں لاسکتا ہے۔

جدید سائنس کئی سو سال سے فلکیات کا مطالعہ کر رہی ہے۔ 1508 میں دوربین (telescope) کی ایجاد ہوئی، اور 1609 میں پہلی بار اٹلی کے سائنس داں گلیلیو (Galileo) نے خلا کا دوربینی مشاہدہ کیا۔ یہ فلکیاتی مشاہدہ برابر بڑھتا رہا۔ پچھلے زمانے میں دوربینی رصدگاہ کسی پہاڑ پر نصب کی جاتی تھی۔ اب خلائی سائنس کا زمانہ آ گیا ہے۔ اب انسان نے خلائی رصدگاہ (space observatory) بنالی ہے۔ اِس کے ذریعے کائنات کا مشاہدہ اتنی زیادہ دور تک کرنا ممکن ہو گیا ہے جس کی دوری کو صرف سالِ نور (light years) کی اصطلاح میں بیان کیا جاسکتا ہے۔ اِس طرح خدا کی عظمت کو تصور میں لانے کے لیے ایک نیا وسیع تر دائرہ انسان کے علم میں آ گیا ہے۔

اس سلسلے میں ایک تازہ ترین فلکیات دریافت (discovery) سامنے آئی ہے۔ اِس میں بتایا گیا ہے کہ خلا میں نصب الکٹرانک دوربینوں کے ذریعے ایک بہت بڑا بلیک ہول دریافت ہوا ہے۔ یہ بلیک ہول پورے نظامِ شمسی (solar system) کو نگل سکتا ہے۔ نظامِ شمسی کا دائرہ کتنا زیادہ بڑا ہے، اس کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے اِس نظام کا بعید ترین سیارہ پلوٹو (Pluto) ہے جو سورج کے گرد

بیضوی دائرے میں چکر لگا رہا ہے۔ یہ دائرہ ساڑھے سات بلین میل پر مشتمل ہے۔

مذکورہ بلیک ہول اب تک کے دریافت کردہ تمام بلیک ہول سے زیادہ بڑا ہے۔ اس کا حجم 6 بلین سورج سے بھی زیادہ ہے۔ اِس بلیک ہول کا نام M 87 رکھا گیا ہے۔ یہ بلیک ہول ہماری کہکشاں (Milky Way) سے 50 ملین سال نور کی دوری پر واقع ہے:

This black hole can eat the solar system

Astronomers have discovered what they say is the biggest ever black hole which weighs the same as 6.8 billion suns and could swallow our entire solar system. According to the scientists, the black hole, identified as M87, is as large as the orbit of Neptune and is by far the largest and most distant galaxy in the nearby universe. As a point of comparison, the black hole at the centre of the Milky Way is 1,000 times smaller than this one which has been observed some 50 million light years away. (*The Times of India,* New Delhi, Tuesday, January 18, 2011 Page 19)

یہ واقعہ اور اِس طرح کے دوسرے واقعات معرفتِ الٰہی کے لیے عظیم خزانے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ واقعات خدا کی قدرت کو ناقابلِ قیاس حد تک عظیم بنا دیتے ہیں۔ جو آدمی اِن واقعات پر سوچے گا، اس کا دل خدا کی عظمت کے تصور سے دہل اٹھے گا، اس کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے۔ یہ واقعات ایک انسان کو اپنے بارے میں انتہائی عجز اور خدا کے بارے میں انتہائی قدرت کی یاد دلاتے ہیں۔ اِن واقعات پر غور کرنا بلاشبہہ اعلیٰ معرفت کے حصول کا کائناتی خزانہ ہے۔

معرفت یہ ہے کہ آدمی ایک طرف اپنی محدودیت (limitation) کو جانے اور دوسری طرف وہ خدا کی لامحدودیت کو دریافت کرے۔ اِس دریافت کے نتیجے میں جو کیفیت آدمی کے اندر پیدا ہوتی ہے، اُسی کا نام معرفت ہے۔ یہ معرفت جس کو حاصل ہو جائے، اس کے لیے گویا دنیا اور آخرت کی تمام سعادتوں کے دروازے کھل گئے۔ یہی وہ خوش قسمت انسان ہے جس کے بارے میں آخرت میں کہا جائے گا کہ — تم جنت کے دروازوں میں سے جس دروازے سے چاہو، جنت میں داخل ہو جاؤ۔ آج کے بعد تمھارے لیے نہ کوئی خوف ہے اور نہ کوئی حزن۔

شخصیت کی تعمیر

تجربہ بتاتا ہے کہ انسان بچپن میں معصوم کلی کی مانند ہوتا ہے۔ لیکن بڑا ہونے کے بعد اس کی شخصیت میں طرح طرح کے بگاڑ آجاتے ہیں۔ مثلاً ضد اور سرکشی وغیرہ۔ شخصیت کی تعمیر کا مطلب یہ ہے کہ آدمی یا تو اپنی پیدائشی فطرت کو اُسی حالت میں محفوظ رکھے، جس حالت میں وہ ماں کے پیٹ سے نکلا تھا، یا وہ مویشیوں کی طرح جُگالی کا طریقہ اختیار کرے، یعنی بعد کو اس کی شخصیت پر جو مصنوعی پردے پڑ گئے تھے، اُن کو ایک ایک کرکے ہٹانا، یہاں تک کہ اصل فطرت آمیزشوں سے پاک ہوکر سامنے آجائے۔

جدید نفسیاتی تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ انسان کے دماغ کے تین بڑے حصے ہیں۔ یہ تینوں حصے ہر عورت اور ہر مرد کے دماغ میں پائے جاتے ہیں۔ وہ پیدائشی طور پر ہر انسانی دماغ کا حصہ ہیں۔ وہ تین حصے یہ ہیں:

1- شعوری ذہن (conscious mind)

2- تحت شعور (sub-conscious mind)

3- لاشعور (unconscious mind)

تجربہ وتحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ کوئی بھی خیال جب ایک بار دماغ میں آجائے تو وہ ہمیشہ کے لیے انسانی ذہن (human mind) کا حصہ بن جاتا ہے، اور جیسا کہ معلوم ہے، انسانی ذہن ہی دراصل انسانی شخصیت کا دوسرا نام ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی خیال انسان کے دماغ میں آجائے تو وہ ہمیشہ کے لیے انسان کی شخصیت کا حصہ بن جاتا ہے، حتیٰ کہ اگر وہ اس کو اپنی شخصیت سے الگ کرنا چاہے تو وہ اس کو الگ کرنے پر قادر نہیں ہوتا۔

جب کوئی بات انسان کے دماغ میں آتی ہے، خواہ وہ منفی ہو یا مثبت تو وہ سب سے پہلے دماغ کے شعوری حصے میں آتی ہے۔ اس کو زندہ حافظہ بھی کہا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد آدمی جب رات کو سوتا ہے تو فطری عمل کے تحت اپنے آپ ایسا ہوتا ہے کہ وہ بات شعوری ذہن سے چل کر ذہن کے تحت شعور میں

پہنچ جاتی ہے۔ جب ایسا ہوتا ہے تو اس خیال کے اوپر آدمی کا شعوری کنٹرول صرف پچاس فی صدرہ جاتا ہے۔ پچاس فی صدوہ اس کے شعوری کنٹرول سے باہر ہوجاتا ہے۔ اس کے بعد جب وہ اگلی رات کو سوتا ہے تو یہ خیال مزید سفر کرکے ذہن کے لاشعور حصے میں پہنچ جاتا ہے۔ جب ایسا ہوتا ہے تو اس کے بعد یہ خیال آدمی کے شعوری کنٹرول سے پوری طرح باہر ہوجاتا ہے۔

یہی روزمرہ کے افکار جو انسان کے ذہن میں آتے ہیں، وہی اس کی شخصیت کی تعمیر کرتے ہیں۔ جیسے افکار ویسی شخصیت۔ مثبت افکار سے مثبت شخصیت بنے گی۔ لیکن اگر یہ افکار منفی افکار ہوں تو انسان کی شخصیت بھی منفی بنتی چلی جائے گی۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ سب سے بُری شخصیت منفی شخصیت ہے اور سب سے زیادہ اچھی شخصیت وہ ہے جو مثبت شخصیت ہو۔ ایسی حالت میں یہ سوال ہے کہ مثبت شخصیت کی تعمیر کس طرح کی جائے۔

اس کا طریقہ یہ ہے کہ جب کوئی منفی خیال آدمی کے ذہن میں آجائے تو وہ اس کو پہلے ہی مرحلے میں ختم کردے۔ خصوصی تدبیر کے ذریعے اُس کے منفی پہلو کو مثبت پہلو میں تبدیل کرلے۔ مثلاً وہ غصہ ہو تو فوراً معاف کردے تاکہ اس کا غصہ انتقام کی صورت اختیار نہ کرنے پائے۔ کسی کی ترقی اُس کو پسند نہ آئے تو اُسی وقت وہ اس کو نظر انداز کردے تاکہ وہ اس کی شخصیت میں حسد بن کر شامل نہ ہوسکے، وغیرہ۔ ہر منفی خیال کے ساتھ فوراً ہی تصحیح (correction) کا یہ عمل کرنا چاہیے۔ اگر اس میں دیر ہوئی تو جلد ہی ایسا ہوگا کہ وہ آدمی کے تحت شعور میں چلا جائے گا اور پھر کچھ عرصے بعد وہ اس کے لاشعور میں داخل ہوجائے گا۔ اور جب ایسا ہوگا تو وہ آدمی کی شخصیت کا اس طرح لازمی حصہ بن جائے گا کہ آدمی چاہے بھی تو وہ اس کو اپنی شخصیت سے جُدا نہ کرسکے۔

لوگ عام طور پر ایسا نہیں کرتے اور اس کی یہ بھیانک قیمت ادا کررہے ہیں کہ ہر ایک، خوبصورت کپڑوں کے پیچھے ایک منفی شخصیت کی لاش لیے ہوتا ہے۔ منفی شخصیت دراصل جہنمی شخصیت ہے۔ جو عورت یا مرد اس ہلاکت خیز انجام سے بچنا چاہتے ہوں ان کو چاہیے کہ وہ مذکورہ عملِ تصحیح کو اپنی روزانہ کی زندگی میں شامل کرلیں۔ اس کے سوا اس مسئلے کا کوئی اور حل موجود نہیں۔

بڑھاپے کی عمر

قرآن کی سورہ فاطر میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: **أولم نعمّركم ما يتذكر فيه من تذكر** (34:37) یعنی کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہیں دی کہ جو شخص یاددہانی حاصل کرنا چاہے، وہ اس میں یاددہانی حاصل کر سکے۔ اِس مفہوم کی متعدد روایتیں حدیث کی کتابوں میں آئی ہیں۔ ملاحظہ ہو: **فتح الباري، كتاب الرقاق، باب من بلغ ستين سنة۔**

حدیث میں آیا ہے کہ جس آدمی کو لمبی عمر یا بڑھاپے کی عمر ملے، اس کے پاس اللہ کے سامنے پیش کرنے کے لیے کوئی عذر باقی نہیں رہا۔ آدمی کے اوپر پہلے بچپن کا دور آتا ہے، اس کے بعد جوانی کا دور آتا ہے، اس کے بعد بڑھاپے کا دور آتا ہے۔ بڑھاپے کا دور موجودہ دنیا میں کسی انسان کے لیے آخری دور ہے۔ کیوں کہ اس کے بعد جو مرحلہ آتا ہے، وہ موت کا مرحلہ ہے، نہ کہ کوئی اور مرحلہ۔

اِس اعتبار سے بڑھاپا گویا کہ موت کی پیشگی اطلاع (prior notice) کی حیثیت رکھتا ہے۔ بڑھاپے میں جسم کے تمام اعضا (organs) کمزور ہو جاتے ہیں، حتی کہ بعض اعضا اپنا کام کرنا بند کر دیتے ہیں۔ یہ واقعات بتاتے ہیں کہ موت کا وقت قریب آ گیا۔ وہ گویا کہ موت کی جبری یاددہانی (compulsory reminder) ہیں۔ بڑھاپا آدمی کو قبر کے کنارے کھڑا کر دیتا ہے۔

اگر آدمی کا ذہن بیدار ہو تو بڑھاپے کی عمر کو پہنچ کر وہ سوچنے لگے گا کہ اب بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے، جب کہ میری موت واقع ہو اور میں اللہ کے سامنے حساب کتاب کے لیے حاضر کر دیا جاؤں۔ اِس طرح بڑھاپے کے تجربات آدمی کو جھنجھوڑتے ہیں، وہ اس کو آخرت کی یاددہانی کراتے ہیں۔ بڑھاپا آدمی کو بتاتا ہے کہ موجودہ دنیا میں تمھارا سفر اب ختم ہو چکا۔ اب تمھیں لازماً اگلے دورِ حیات میں داخل ہونا ہے اور حشر کی خدائی عدالت کا سامنا کرنا ہے — بلاشبہہ وہ انسان سب سے زیادہ بدبخت انسان ہے جس کو بڑھاپے کا زمانہ ملا، لیکن وہ اس سے یاددہانی حاصل نہ کر سکا، وہ بدستور غفلت میں رہا، یہاں تک کہ وہ اِسی حال میں مر گیا۔

انسانی تاریخ کے چار دور

Four Phases of Human History

خدا کے تخلیقی پلان (creation plan of God) کے مطابق، انسانی تاریخ کے چار دور ہیں۔ یہ چار ادوار گویا کہ انسانی معرفت کے چار ادوار ہیں۔ یہ ایک طویل ربانی سفر ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ انسان خدا کی معرفت (realization of God) حاصل کرے، تاکہ اُس کو خدا کی ابدی جنت میں قیام کی سعادت حاصل ہو سکے۔

معرفت کیا ہے۔ معرفت خدا کی دریافت کا نام ہے جو بلاشبہہ سب سے بڑی حقیقت ہے۔ خدا سب سے زیادہ ظاہر بھی ہے، اور سب سے زیادہ مستور (the most obvious, the most unknown) بھی۔ معرفت کے حصول کے لیے انسان کو ایک پورا سمندر پار کرنا ہوتا ہے۔ جو لوگ اِس سمندر کو پار کرنے کا ثبوت دیں، وہی صاحب معرفت ہیں، اور انھیں کے لیے یہ مقدر ہے کہ وہ ابدی جنتوں میں داخل ہوں۔

جنت کی قیمت — معرفت

قرآن کی سورہ الذاریات میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **وما خلقت الجنّ والإنس إلاّ ليعبدون** (51:65) یعنی میں نے جن اور انسان کو صرف اِس لیے پیدا کیا ہے تاکہ وہ میری عبادت کریں۔ مجاہد تابعی (وفات: 722ء) نے حضرت عبداللہ بن عباس (وفات: 687ء) کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اِس آیت میں عبادت سے مراد معرفت ہے: **قال مجاهد إلاّ ليعبدون، أي إلاّ ليعرفوني** (القرطبی، جلد 17، صفحہ 55) یعنی اِس آیت میں خدا کی عبادت سے مراد خدا کی معرفت ہے۔ یہی قول ابن جُریج تابعی (وفات: 767ء) سے بھی منقول ہے: **قال ابنُ جُريج إلاّ ليعبدون، أي إلاّ ليعرفون** (تفسیر القرآن العظیم لإبن کثیر، جلد 4، صفحہ 338)۔

اِس سلسلے میں ایک متعلق روایت بعض کتابوں میں آئی ہے۔ بعض محدثین نے اِس روایت پر

اس کی سند کے اعتبار سے کلام کیا ہے۔ لیکن سترھویں صدی عیسوی کے مشہور فقیہ علی بن محمد نورالدین ملّا علی قاری (وفات: 1606ء) نے کہا کہ: **لٰکن معناه صحيح، مُستفاد من قوله تعالىٰ: وما خلقتُ الجن والإنس إلا ليعبدون، أي ليعرفوني** (**كشف الخفاء، جلد2، صفحہ 1011**) یعنی اس کا مفہوم صحیح ہے، اور وہ اِس آیتِ قرانی سے ماخوذ ہے: **وما خلقت الجن والإنس إلا ليعبدون۔**

اِس روایت کے الفاظ یہ ہیں: **كنتُ كنزاً مخفيا فأحببتُ أن أُعرف، فخلقتُ خلقاً فبي عرفوني** (**كشف الخفاء، رقم: 2016**) یعنی میں ایک مخفی خزانہ تھا، پھر میں نے چاہا کہ مجھ کو جانا جائے، پھر میں نے انسان کو پیدا کیا، پھر انھوں نے مجھے جانا۔

اِس سے اور متعدد دوسرے حوالوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان سے اصل مقصود یہ ہے کہ وہ اپنے خالق کی معرفت (realization) حاصل کرے۔ یہی معرفت تمام انسانی کمالات کا سرچشمہ ہے۔ انسان کو جب حقیقی معنوں میں خدا کی معرفت حاصل ہوجائے تو اِس سے اُس کے اندر تمام خوبیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اور یہی اس کے لیے ہر قسم کے شر سے دور رہنے کا محرک بن جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ معرفت ہی دینِ خداوندی کی اصل روح ہے۔

خدا نے اپنے تخلیقی پلان (creation plan) کے مطابق، اِس دنیا میں معرفت کے حصول کا اعلیٰ ترین انتظام کیا ہے۔ جو شخص اِس معاملے میں سنجیدہ ہو، وہ کبھی معرفت کے حصول سے محروم نہیں رہ سکتا۔ خدا کے تخلیقی پلان کے مطابق، اِس انتظام کے چار درجے ہیں۔ اِس اعتبار سے، یہ کہنا صحیح ہوگا کہ انسانی تاریخ کے چار دور ہیں (phases) ہیں۔ ابتدائی تین دور سے گزرتے ہوئے اب انسانی تاریخ اپنے چوتھے دور میں داخل ہوچکی ہے۔ اِس کے بعد کوئی پانچواں دور نہیں۔ اِس کے بعد قیامت ہے اور ہر انسان کا اپنے ابدی انجام کے دور میں پہنچ جانا۔ تاریخ کے یہ چار دور حسب ذیل ہیں:

1. Realization at the level of unconsciousness
2. Realization at the level of consciousness
3. Realization through partial uncovering of the truth
4. Realization through total uncovering of the truth.

لاشعور کی سطح پر معرفت

قرآن میں ابتدائی انسان کے بارے میں جو باتیں بتائی گئیں ہیں، اُن میں سے ایک وہ ہے جس کو 'عہدِ الست' کہا جاتا ہے، یعنی پہلا خدائی عہد (first divine covenant)۔ اِس واقعہ کا ذکر قرآن کی سورہ نمبر سات میں آیا ہے۔ قرآن کی اِس آیت کا ترجمہ یہ ہے: ''اور جب تیرے رب نے بنی آدم کی پیٹھوں سے ان کی اولاد کو نکالا اور ان کو گواہ ٹھیرایا خود اُن کے اوپر— کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں۔ انھوں نے کہا ہاں، ہم اقرار کرتے ہیں۔ یہ اِس لیے ہوا کہ کہیں تم قیامت کے دن کہنے لگو کہ ہم کو تو اِس کی خبر نہ تھی'' (7:172)

اِس آیت کے تحت، عبداللہ بن عباس کی ایک روایت نقل ہوئی ہے۔ وہ کہتے ہیں: **ردّهم في أصلاب أبائهم حتّى أخرجهم قرناً بعد قرن** (**الرد على الجهمية لابن منده، رقم الحديث**: 38)۔ یعنی خدا نے ذریت بنی آدم کو دوبارہ اُن کے آباء کے صُلب میں لوٹا دیا اور پھر مختلف ادوار میں وہ ان کو پیدا کرتا رہا۔ اس سے معلوم ہوا کہ خدا نے آغازِ حیات میں تمام انسانوں کو بیک وقت پیدا کیا، پھر اُن سے مذکورہ عہد لیا۔ یہ عہد کیا تھا۔ جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عباس سے مروی ہے، یہ عہد معرفت کا عہد تھا۔ ابن جریر طَبری نے اِس سلسلے میں اپنی تفسیر میں یہ روایت نقل کی ہے: **قال ابن عباس..... ثمّ أخذ عهودهم على الإيمان والمعرفة له** (**جامع البيان عن تأويل آي الفرقان**، جلد 9، صفحہ 114) یعنی ذریتِ آدم کو پیدا کرنے کے بعد خدا نے اُن سے ایمان اور معرفت کا عہد لیا۔

اِس کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے اپنی معرفت کو ہر انسان کے لاشعور میں داخل کر دیا۔ اب ہر انسان جو پیدا ہوتا ہے، وہ لاشعور کی سطح پر معرفتِ خداوندی کو لے کر پیدا ہوا ہے۔ اِس معاملے میں کسی عورت، یا کسی مرد کا کوئی استثنا (exception) نہیں۔

مگر تاریخ بتاتی ہے کہ آغازِ حیات سے اب تک بہت کم لوگ ایسے نکلے جو اپنے اِس لاشعور کو پڑھیں، جو اپنی فطرت کی اِس داخلی آواز کو سن سکیں۔ اِس فطری معاملے کی بنا پر ایسا تو ہوا کہ ہر شخص کسی

نہ کسی درجے میں حق کا متلاشی (seeker) بنا، لیکن بہت تھوڑے افراد کو چھوڑ کر، کوئی بھی اپنی تلاش کو اس کی آخری منزل تک نہ پہنچا سکا۔

اِس عمومی ناکامی کا سبب کیا ہے۔ اِس کا جواب قرآن کی ایک آیت سے معلوم ہوتا ہے۔ قرآن کی سورہ القیامہ میں ارشاد ہوا ہے: **بل الإنسان علی نفسه بصیرة، ولو القیٰ معاذیره** (75:14-15) یعنی حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنے اوپر آپ گواہ ہے، خواہ وہ کتنے عُذرات پیش کرے۔

اِس قرآنی بیان سے معلوم ہوا کہ انسان کی اِس ناکامی کا اصل سبب عُذرات (excuses) ہیں۔ انسان کی داخلی فطرت ہر موقع پر اس کی خاموش رہنمائی کرتی ہے۔ اِسی فطرت کو قرآن میں داخلی برہان (24:12) کہا گیا ہے۔ لیکن انسان یہ کرتا ہے کہ وہ ایک عُذر (excuse) لے کر، فطرت کی اِس آواز کو نظر انداز کر دیتا ہے۔

مثال کے طور پر ایک شخص کسی زندہ یا مردہ ہستی کو بڑا مان کر اُس کی پرستش شروع کر دے گا۔ پھر اُس کا ربانی لاشعور اندر سے اس کو آواز دے گا کہ پرستش تو صرف خالق کا حق ہے، تم مخلوق کی پرستش کیوں کر رہے ہو۔ مگر یہاں اس کا ذہن ایک خود ساختہ عذر تلاش کر لے گا۔ وہ کہے گا کہ میں اس زندہ یا مردہ ہستی کو خدا نہیں ماننا، بلکہ ان کو خدا کا مقرب مانتا ہوں۔ یہ لوگ خدا کے ساتھ خصوصی تعلق رکھتے ہیں۔ وہ میرے لیے خدا کے یہاں وسیلہ بن سکتے ہیں۔ اس لئے میں ان کے آگے جھک کر ان کو راضی کر رہا ہوں، تاکہ وہ خدا کے یہاں میرے سفارشی بن سکیں۔

اِس قسم کا عذر بلاشبہہ ایک بے بنیاد عذر ہے۔ وہ ہرگز خدا کے یہاں قبول کیا جانے والا نہیں۔ لیکن بے شمار لوگ ایسے ہیں جو اِس قسم کے خود ساختہ خیال میں جیتے رہے اور اسی میں مر گئے۔

اسی طرح ایک شخص کسی معاملے میں ایک آدمی کے اوپر غصہ ہو جائے گا۔ وہ اس سے انتقام لینا چاہے گا۔ اب اس کے اندر کی خدائی آواز اس کو پکارے گی اور کہے گی کہ انتقام لینا ایک گناہ کا کام ہے۔ تم اُس شخص سے درگزر کا معاملہ کرو اور اس کو معاف کر دو۔ مگر اس کا ذہن فوراً ایک عذر تلاش کر لے گا۔ وہ کہے گا کہ ایسے آدمی کو سبق سکھانا ضروری ہے۔ اگر تم اِس وقت خاموش ہو گئے تو وہ اور

دلیر ہو جائے گا اور تمھارے خلاف مزید کارروائی کرے گا۔

یہ عذر بھی ایک بے بنیاد عذر ہے۔ ایسا عذر کبھی خدا کے یہاں قابلِ قبول نہیں ہوسکتا۔ لیکن بے شمار لوگ اِس خود ساختہ عذر میں جیتے ہیں اور اِسی میں مر جاتے ہیں۔

شعور کی سطح پر معرفت

لاشعور کی سطح پر معرفت کا انتظام کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے شعور کی سطح پر انسان کی ہدایت کے لیے دوسرا انتظام فرمایا۔ اب خدا نے معرفت کو منطوق آواز (spoken language) کی صورت میں ظاہر کیا۔ یہ کام خدا کے پیغمبروں کے ذریعے انجام پایا۔ اِس مقصد کے لیے خدا نے مسلسل طور پر پیغمبر بھیجے۔ اِن پیغمبروں کو خدا نے بذریعہ وحی، معرفت کا علم دیا۔ پھر انھوں نے لوگوں کی قابلِ فہم زبان میں اُن کو زندگی کی اِس حقیقت سے باخبر کیا، تاکہ لوگ شعور کے درجے میں اُس معرفت کو حاصل کرسکیں، جو لاشعور کے درجے میں ان کی فطرت میں پیوست کردی گئی تھی۔

مگر عجیب بات ہے کہ حصولِ معرفت کا یہ دوسرا انتظام بھی انسان کے لیے کافی ثابت نہیں ہوا۔ دوبارہ یہی ہوا کہ انسان، پیغمبروں اور داعیوں کی ساری کوشش کے باوجود وہ ان کو نظر انداز کرتا رہا۔ وہ پیغمبروں کی تمام تر دعوتی جدوجہد کے باوجود شعور کی سطح پر حقیقت کو دریافت نہ کرسکا۔

ایسا کیوں ہوا۔ اِس کا جواب قرآن کی ایک آیت سے معلوم ہوتا ہے۔ قرآن کی سورہ یٰس میں ارشاد ہوا ہے: **یحسرة علی العباد، ما یأتیهم من رسول إلّا کانوا به یستهزء ون** (36:30) یعنی افسوس ہے بندوں کے اوپر، جو پیغمبر بھی ان کے پاس آیا، وہ اس کا استہزا کرتے رہے:

Alas for human beings! They ridicule
every prophet that comes to them.

کوئی آدمی جب کسی کا استہزا کرتا ہے، یا اس کا مذاق اڑاتا ہے تو اس کا سبب صرف ایک ہوتا ہے، اور وہ ہے اس کو حقیر سمجھنا۔ چناں چہ جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم، قدیم عرب میں پیغمبر کی حیثیت سے آئے، تو وہاں کے سرداروں نے کہا: **لولا نُزّل هٰذا القرآن علیٰ رجل من**

القریتین عظیم (43: 31) یعنی یہ قرآن دونوں بستیوں (مکہ اور طائف) میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہیں اتارا گیا۔

اِس معاملے کی مزید وضاحت قرآن کے ایک اور بیان سے ہوتی ہے۔ اِس سلسلے میں قرآن کی سورہ الانعام کی چند آیتوں کا ترجمہ یہ ہے: ''اور وہ کہتے ہیں کہ پیغمبر پر کوئی فرشتہ کیوں نہیں اتارا گیا۔ اور اگر ہم کوئی فرشتہ اتارتے تو معاملے کا فیصلہ ہو جاتا، پھر انھیں کوئی مہلت نہ ملتی۔ اور اگر ہم کسی فرشتے کو پیغمبر بنا کر بھیجتے، تو اُس کو بھی ہم آدمی بناتے اور اُن کو اُسی شبہہ میں ڈال دیتے جس میں وہ اب پڑے ہوئے ہیں۔ اور تم سے پہلے بھی رسولوں کا مذاق اڑایا گیا، تو اُن میں سے جن لوگوں نے مذاق اُڑایا، اُن کو اُس چیز نے آگھیرا جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے'' (6: 8-10)۔

قرآن کا یہ بیان پیغمبروں کی تاریخ پر ایک تبصرہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہر پیغمبر بظاہر عام انسانوں کی طرح انسان ہوتا تھا۔ اِس لیے جب خدا اُس پر وحی بھیجتا اور وہ لوگوں سے کہتا کہ مجھے خدا نے اپنا پیغام پہنچانے کے لیے تمھارے پاس بھیجا ہے، تو وہ یہ دیکھ کر اس کو نظر انداز کر دیتے کہ تم تو ہم کو ایک معمولی انسان دکھائی دیتے ہو، پھر کیوں ہم تم کو خدا کا پیغمبر مانیں۔

اِس کا جواب مذکورہ آیت میں یہ دیا گیا کہ خدا کے قانون کے مطابق، یہ التباس کا ایک معاملہ ہے۔ امتحان کی مصلحت کی بنا پر اِس دنیا میں ہمیشہ سچائی کے ساتھ ایک شبہہ کا عنصر (element of doubt) موجود رہتا ہے۔ اِس مصلحت کی بنا پر یہی ہوگا کہ خدا کا پیغام کسی غیر معمولی فرشتے کے ذریعے نہیں دیا جائے گا، بلکہ ایک انسان کے ذریعے دیا جائے گا۔ تم سچائی کو صرف اُسی وقت پا سکتے ہو جب کہ تم شبہہ کے پردے کو پھاڑو اور خالص جوہرِ ذاتی (merit) کی بنیاد پر حق کے داعی کو پہچانو۔

معرفت بذریعہ آیاتِ کائنات

اِس کے بعد اللہ تعالیٰ نے معرفتِ حق کے لیے ایک اور انتظام کیا۔ یہ انتظام تھا— خدا کی تخلیق میں چھپی ہوئی نشانیوں کو ظاہر کرنا۔ اِس خدائی منصوبہ کا ذکر قرآن کی سورہ نمبر 41 میں پیشگی طور پر کیا گیا تھا۔ اِس آیت کا ترجمہ یہ ہے: ''مستقبل میں ہم اُن کو اپنی نشانیاں دکھائیں گے، آفاق میں بھی

اورانفس میں بھی۔ یہاں تک کہ اُن پر پوری طرح یہ کھل جائے کہ یہ قرآن حق ہے‘‘ (41:53)۔

خدا نے اپنے اِس خصوصی منصوبہ کو موجودہ زمانے میں سائنس دانوں کے ذریعے پورا کیا۔ موجودہ زمانے میں سائنس دانوں نے عالمِ طبیعیات (physical world) میں جو دریافتیں کی ہیں، وہ دریافتیں گویا کہ آلاء اللہ کا مشاہداتی اظہار ہیں۔ خدا نے اپنے پیغمبر ابراہیم کو **ملکوت السماوات والارض** (6:76) کا خصوصی مشاہدہ کرایا تھا۔ اب اللہ تعالیٰ نے اپنی اِن نشانیوں (sign) کو خود علمِ انسانی کے ذریعے عمومی سطح پر لوگوں کے لیے قابلِ مشاہدہ بنا دیا۔

موجودہ زمانے میں اِس موضوع پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ راقم الحروف نے بھی اِس موضوع پر کئی کتابیں لکھی ہیں۔ امریکا کے ایک سائنس داں ڈاکٹر کریسی ماریسن (وفات: 1951) نے اِس موضوع پر ایک کتاب شائع کی ہے۔ اِس کتاب کا انگریزی ٹائٹل (*Man Doesn't Stand Alone*) ہے۔ اِس کتاب کا عربی ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔ اِس عربی ایڈیشن کا نام بامعنیٰ طور پر یہ ہے: **الله يتجلّى في عصر العلم**۔

مگر دوبارہ ایسا ہوا کہ بہت کم ایسے انسان نکلے جو اِس سائنسی انقلاب سے معرفت کی غذا لے سکیں۔ انسانوں کی بہت بڑی اکثریت نے دوبارہ یہ غلطی کی کہ اُس نے انحراف کا ایک طریقہ اختیار کیا اور انسان دوبارہ معرفت کے حصول سے محروم رہا۔

اصل یہ ہے کہ جدید سائنس کے دو شعبے ہیں۔ ایک ہے، نظریاتی سائنس (theoretical science)، اس کا دوسرا شعبہ وہ ہے جس کو انطباقی سائنس (applied science) کہا جاتا ہے۔ نظریاتی سائنس کامل طور پر معرفت کی سائنس تھی۔ اُس کے مطالعے سے انسان، خدا کو اور خدائی حقیقتوں کا علم حاصل کر سکتا تھا۔ لیکن انسان نے نظریاتی سائنس سے یہ خدائی رزق نہیں لیا، وہ بدستور معرفت سے محروم بنا رہا۔

انطباقی سائنس وہ ہے جس کو دوسرے لفظوں میں ٹکنکل سائنس (technical science) کہا جاتا ہے۔ سائنس کی دریافتوں نے ایک نئی ٹکنالوجی دی۔ اِس جدید ٹکنالوجی کے ذریعے نئی مشینیں بنیں،

نئی قسم کی بلڈنگیں تیار کی گئیں، نئی قسم کی سواریاں بنیں، نئی قسم کی اشیاءِ صرف (consumer goods) وجود میں آئیں۔ سماجی ترقی کا وہ اعلیٰ نظام قائم ہوا جس کو جدید تہذیب (modern civilization) کہا جاتا ہے، وغیرہ۔

مذکورہ قسم کی صنعتی ترقیوں سے جدید انداز کے پُرکشش شہر وجود میں آئے۔ اِن ترقیوں کے نتیجے میں انسان کو عیش اور راحت کا جو سامان ملا، وہ مادی اعتبار سے اتنا پرکشش تھا کہ انسان اس میں کھو گیا۔ انسان نے شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ سمجھا کہ جدید ترقیوں کے بعد اب یہ ممکن ہو گیا ہے کہ وہ اِسی دنیا میں اپنی جنت بنا سکے۔ وہ بعد از موت دورِ حیات (post death period) میں ملنے والی جنت کا انتظار نہ کرے، بلکہ قبل از موت دورِ حیات (pre-death period) میں اپنی جنت بنا کر اُس میں عیش کی زندگی گزارے۔

جدید سائنس، انسان کے لیے معرفت کی روشنی تھی، لیکن انسان اُس سے معرفت کی روشنی حاصل کرنے میں ناکام رہا۔ اِس طرح یہ ہوا کہ خدا نے معرفت کا جو تیسرا دروازہ کھولا تھا، وہ بھی انسان کی نادانی سے اس کے اوپر بند پڑا رہا۔

معرفت بذریعہ فائنل اظہار

خدا کے تخلیقی پلان (creation plan of God) کے مطابق، انسان سے جو معرفت مطلوب ہے، وہ براہِ راست مشاہدہ کے بغیر مطلوب ہے۔ اِسی بلا مشاہدہ معرفت کو قرآن میں ایمان بالغیب (2:3) کہا گیا ہے۔

اوپر معرفت کے جن تین درجوں کا ذکر کیا گیا، اُن کا تعلق اِسی قسم کی بلا مشاہدہ معرفت سے ہے۔ انسان کی پچھلی تاریخ، معرفت کے اِنھیں تینوں درجات کی تاریخ کا دوسرا نام ہے۔ مگر جب انسان اِس نوعیت کی معرفت کے حصول میں ناکام رہے، تو وہ وقت آجاتا ہے جب کہ حقیقت سے پردہ اٹھا دیا جائے، تاکہ انسان اُن حقیقتوں کو براہِ راست طور پر دیکھ لے جن کو وہ بالواسطہ طور پر دیکھنے میں ناکام ہو گیا تھا۔ یہ بات قرآن میں بار بار مختلف انداز سے بتائی گئی ہے۔

اِس نوعیت کی چند قرآنی آیتوں کا ترجمہ یہ ہے:

''اور موت کی بے ہوشی حق کے ساتھ آ پہنچی، یہ وہی چیز ہے جس سے تم بھاگتے تھے۔ اور صور پھونکا جائے گا، یہ ڈرانے کا دن ہوگا۔ ہر شخص اِس طرح آ گیا کہ اُس کے ساتھ ایک ہانکنے والا ہے اور ایک گواہی دینے والا۔ تم اِس دن سے غفلت میں رہے، پس ہم نے تمھارے اوپر سے پردہ ہٹا دیا، تو آج تمھاری نگاہ تیز ہے'' (50: 19-22)

مذکورہ قرآنی آیت میں انسانی تاریخ کے آخری دور (final phase of human history) کا ذکر ہے۔ انسانی تاریخ کے اِسی آخری دور کا دوسرا نام قیامت (Doomsday) ہے۔ حالات بتاتے ہیں کہ اب اِس آخری دور کے ظاہر ہونے کا وقت بالکل قریب آ پہنچا ہے۔ تمام دنیا کے سائنس داں متفقہ طور پر جس گلوبل وارمنگ (global warming) کی خبر دے رہے ہیں، وہ دراصل گلوبل وارننگ (global warning) ہے۔

سائنس دانوں کے مشاہدے کے مطابق، انسانی تاریخ کے خاتمہ کا عمل تیزی سے شروع ہو چکا ہے۔ بہت جلد ایسا ہوگا کہ زمین کے اوپر قائم کردہ لائف سپورٹ سسٹم بالکل تباہ ہو جائے گا۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بہت جلد دنیا انسان کے لیے ناقابلِ رہائش (inhabitable) بن جائے گی۔ جدید سائنسی مشاہدہ یہ بھی بتاتا ہے کہ تباہی کا یہ عمل اتنا زیادہ مہلک ہے کہ وہ اب ناقابلِ اعادہ (irreversible) بن چکا ہے۔ اب اس کو دوبارہ پیچھے کی طرف لوٹایا نہیں جا سکتا۔

قرآن کے مطابق، دنیا کا آخری خاتمہ اُس وقت ہوگا جب کہ فرشتہ اسرافیل اپنا صور پھونک دے۔ تاہم اِس آخری انجام سے پہلے خدا کچھ نشانیاں ظہور میں لا رہا ہے۔ یہ انسان کے لیے گویا آخری موقع ہے، تاکہ اب سے وہ ہوش میں آئے اور اپنی اصلاح کر کے اپنے آپ کو ابدی جنت کا مستحق بنا لے — موجودہ گلوبل وارمنگ اور اُس سے پیدا ہونے والے حالات اِسی قسم کی ایک پری فائنل وارننگ (pre-final warning) کی حیثیت رکھتے ہیں۔

گلوبل وارمنگ دراصل قربِ قیامت کی علامت (sign) ہے۔ قرآن اور حدیث میں

اِس علامت کا ذکر صراحت کے ساتھ موجود ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے، سمندر کرۂ ارض کے تین چوتھائی حصے پر محیط ہے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ ایک وقت آئے گا، جب کہ سخت گرمی کے نتیجے میں سمندروں کا پانی کھولنے لگے گا۔ چناں چہ فرمایا: وإذا البحار سُجّرت (81:6) یعنی جب سمندروں کو (آگ سے) بھڑکا دیا جائے گا:

And when the seas are set on fire (81:6)

قیامت سے پہلے پیش آنے والی اِس حقیقت کو حدیث میں مزید وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: إذا كان يوم القيامة أدنيت الشمس من العباد (الترمذي، رقم الحديث: 2421) یعنی جب قیامت کا دن قریب آجائے گا تو سورج انسان کے قریب ہوجائے گا۔ سورج کے قریب آنے کا مطلب یہ ہے کہ سورج کی گرمی قریب آجائے گی۔

موجودہ زمانے میں جس سائنسی انقلاب کا ظہور ہوا، وہ خدا کے منصوبے کے عین مطابق تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ اس کے ذریعے سے نیچر (Nature) میں چھپی ہوئی خدا کی نشانیاں ظاہر ہوں تاکہ انسان اُن سے سبق لے اور خالق کی معرفت حاصل کرکے خالق کی ابدی رحمتوں کا مستحق بنے۔ مگر انسان نے ان چیزوں کو صرف اپنے مادی مقصد کے لیے استعمال کیا۔ اور بظاہر شان دار صنعتی تمدن کی ایک دنیا بنا کر اس میں رہنے لگا۔

صنعتی دریافتوں کا مقصد خالق کی معرفت کا حصول تھا، نہ کہ خود اپنے لیے مادی عیش کی ایک دنیا بنانا۔ یہ سائنسی دریافتوں کا ایک غلط استعمال (misuse) تھا۔ خدا نے اس کو پسند نہیں کیا۔ اِس بنا پر مختلف قسم کی صنعتی خرابیاں (industrial evils) پیدا ہوگئیں۔ مثلاً وہ خرابی جس کو گرین ہاؤس گیس، یا کاربن ایمشن (carbon emission) کہا جاتا ہے۔

کاربن ایمیشن کوئی نیا مسئلہ نہیں، وہ ہمیشہ سے موجود تھا۔ مگر اس سے پہلے یہ تھا کہ خدا کا بنایا ہوا فطری نظام اس کاربن کو اپنے اندر جذب (absorb) کرلیتا تھا۔ اب یہ ہوا کہ خدا کے فطری نظام نے صنعتی کاربن کو جذب کرنا چھوڑ دیا۔ انسان کے پاس اِس نظام کا کوئی بدل موجود نہ تھا، اِس لیے

انسانی سرگرمیاں دھیرے دھیرے صنعتی کثافت (industrial pollution) کی صورت اختیار کرگئیں اور نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا ایک قسم کا گیس چیمبر (gas chamber) بن گئی۔ یہ گویا اِس بات کا اعلان تھا کہ انسان کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ دنیا میں بطور خود اپنی ایک جنت بنا سکے۔ جس طرح موجودہ عارضی دنیا کی تخلیق خدا نے کی ہے، اُسی طرح ابدی جنت کی تخلیق خدا ہی کرسکتا ہے۔ کسی اور کے لیے ایسا کرنا ممکن نہیں۔

اِس معاملے کا ایک علامتی واقعہ وہ ہے جو حال میں پیش آیا۔ امریکا کی ریاست کیلی فورنیا کے بڑے رقبے میں ہرے بھرے جنگل ہیں۔ اِس جنگل کے کنارے ایک دریا بہتا ہے۔ یہ علاقہ نہایت خوب صورت علاقہ ہے۔ جنگل کے دوسری طرف جدید طرز کا ایک ٹاؤن بنایا گیا۔ اس کی خوب صورتی کی بنا پر اس کا نام پیراڈائز (Paradise) رکھ دیا گیا، یعنی جنت۔ یہاں کے لوگ خوشی اور راحتوں کی زندگی گزار رہے تھے۔

اِس کے بعد یہ ہوا کہ جون 2008 میں سخت گرمی کی وجہ سے کیلی فورنیا کے اِن وسیع جنگلوں میں آگ لگ گئی۔ حکومت کی تمام کوششوں کے باوجود آگ پھیلتی گئی، یہاں تک کہ یہ آگ دریا کو پار (jump) کرکے پیراڈائز ٹاؤن میں داخل ہوگئی۔ 10 جولائی 2008 تک اِس ٹاؤن کے 75 مکانات جل کر تباہ ہو چکے تھے۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ گھبراہٹ میں ٹاؤن کو چھوڑ کر بھاگنے لگے۔

اِس واقعے کی خبر میڈیا میں آچکی ہے۔ نئی دہلی کے انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا (11 جولائی 2008) میں اِس واقعے کی رپورٹ حسب ذیل عنوان کے تحت شائع ہوئی ہے:

California fires spark evacuation (p. 23).

آگ لگنے کی یہ خبر اِسی پیراڈائز نامی ٹاؤن کے بارے میں ہے۔ اِس خبر کا عنوان زیادہ درست طور پر یہ ہونا چاہیے — انسانی ساخت کی مادّی جنت میں آگ:

Fire in man-made paradise

امریکا کے پیراڈائز نامی ٹاؤن میں جو آگ لگی ہے، وہی آگ اِس وقت ساری دنیا میں لگی ہوئی

ہے اور وہ تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ اِس عالمی آگ کا نام گلوبل وارمنگ (global warming) ہے۔ یہ صورتِ حال، دنیا کی آخری تباہی سے پہلے پیش آنے والی ابتدائی تباہی ہے۔ یہ دنیا کے خاتمہ سے پہلے اُس کے خاتمہ کا آتشیں اعلان ہے۔ یہ جہنم سے پہلے جہنم کا پیشگی رمائنڈر ہے۔ یہ صورتِ حال بتا رہی ہے کہ کاؤنٹ ڈاؤن (count down) آخر سے پہلے کی گنتی (last but one) تک پہنچ چکا ہے۔

خدا نے دنیا کو دو دوروں میں تقسیم کیا تھا— قیامت سے پہلے کا دور، اور قیامت کے بعد کا دور۔ انسانیت کا قافلہ لمبے سفر کے بعد قیامت سے پہلے کے دور کی آخری شام تک پہنچ چکا۔ اِس کے بعد جو چیز پیش آنے والی ہے، وہ قیامت کے بعد کی صبح ہے۔ آنے والے اِس اگلے دن میں لوگ اپنے عمل کا انجام پائیں گے۔ اِس کے بعد کچھ لوگوں کے لیے ابدی جنت ہوگی اور کچھ لوگوں کے لیے ابدی جہنم۔ کامیاب وہ ہے جو ابدی جنت (eternal paradise) میں جگہ پائے، اور ناکام وہ ہے جو جہنم کے ابدی گڑھے (eternal hell) میں ڈال دیا جائے۔

کیرانہ (مظفر نگر، یوپی) میں صدر اسلامی مرکز کی کتابوں پر مشتمل ایک لائبریری قائم ہوگئی ہے۔ اِس لائبریری سے عمومی استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ لائبریری کا پتہ حسب ذیل ہے:

Mr. Muqeem Ilahi Shamsi
Mahalla Bisatian
Distt. Kairana - 247774
Muzaffer Nagar (UP), Mobile: 09897048535

ہریانہ، پنجاب، ہماچل پردیش، یوپی اور اتراکھنڈ کے قارئینِ الرسالہ اپنا خریداری نمبر یا ایجنسی نمبر بھیج کر دعوتی مقصد کے لیے اردو، ہندی اور انگریزی ترجمہ قرآن مفت حاصل کر سکتے ہیں:

Dr Mohd Aslam Khan
Ayodhya Puram, Mahipura, Dehradun Road
Saharanpur-247001, U.P.
Mobile: 07417629982, 09997153735

کیا قیامت قریب ہے

دسمبر 2009 میں ڈنمارک کی راجدھانی کوپن ہیگن (Copenhagen) میں ایک انٹرنیشنل کانفرنس ہوئی۔ یہ کانفرنس صنعتی سرگرمیوں کے ذریعے بڑھتے ہوئے کاربن ایمیشن (carbon emission) کے موضوع پر تھی۔ اِس میں دنیا بھر کے سائنس داں بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔

اِس موقع پر سائنس دانوں نے یہ وارننگ دی تھی کہ کاربن ایمیشن پر روک لگانا ضروری ہے۔ کیوں کہ فضائی آلودگی (air pollution) کی بنا پر دنیا اب ایک ایسے مقام پر پہنچ گئی ہے جہاں قیامت کے آنے میں اب صرف دو ڈگری کا فاصلہ ہے:

Two Degrees to Doomsday (*The Times of India,* Dec. 5, 2009)

اِس کے بعد سے سائنٹفک جنرل اور میڈیا میں برابر ایسی رپورٹیں چھپ رہی ہیں جو سنگین الارم کی حیثیت رکھتی ہیں۔ کلائمیٹ (climate) کے بارے میں اِن رپورٹوں میں جو بتایا جارہا ہے، اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اب خطرے میں صرف اضافہ ہورہا ہے، اس میں کمی کے کوئی آثار نہیں۔

مثال کے طور پر سائنس دانوں نے بتایا ہے کہ منطقہ قطب شمالی (Arctic region) میں بھاری مقدار میں جو برف ہے، وہ گلوبل وارمنگ کی بنا پر مسلسل تیزی سے پگھل رہی ہے۔ اندیشہ ہے کہ 20 سال کے اندر یہ ساری برف پگھل جائے۔ اس کے بعد بہت بڑی تباہی متوقع ہے۔ کیوں کہ قطب شمالی کی اِس برف کے نیچے بہت بڑی مقدار میں کاربن ڈائی آکسائڈ (carbon dioxide) اور میتھین (methane) گیس کے ذخیرے موجود ہیں۔

برف کے یہ پہاڑ اگر گلوبل وارمنگ (global warming) سے پگھل جائیں تو ایک طرف یہ ہوگا کہ یہ پگھلا ہوا پانی سمندر میں شامل ہوجائے گا اور سمندر کی سطح خطرناک حد تک اونچی ہوجائے گی۔ اور دوسری طرف یہ ہوگا کہ برف کے نیچے بڑی مقدار میں دبی ہوئی خطرناک گیس باہر آجائے گی اور فضائی آلودگی ہلاکت خیز حد تک بڑھ جائے گی۔

Arctic Melt May Speed Up Climate Change In 20 Years

An irreversible climate "tipping point" could occur within the next 20 years as a result of one release of huge quantities of organic carbon locked away as frozen plant matter in the vast permafrost region of the Arctic, scientists have found. Billions of tons of frozen leaves and roots that have lain undisturbed for thousands of years in the permanently frozen ground of the northern hemisphere are thawing out, with potentially catastrophic implications for climate change, the researchers said. A study into the speed at which the permafrost is melting suggests that the tipping point will occur between 2020 and 2030 and will mark the point at which the Arctic turns from being a net "sink" for carbon dioxide into an overall source that will accelerate global warming. The study also found that by 2020 about two-thirds of the Earth's permafrost will have melted, releasing an estimated 190 billion tons of carbon dioxide and methane into the air. "Our results show that as the Arctic warms up, frozen carbon will thaw out, releasing carbon into the atmosphere," said Kevin Schaefer of the US National Snow and Ice Data Centre.

Fear of Warming Peaks As Co_2 Emissions At Record High

Paris: Worldwide carbon emissions are at their highest ever levels, stoking fears of a global temperature rise over the "dangerous" two degree Celsius threshold, the International Energy Agency announced on Monday. The world economy's return to growth in 2010 coincided with a 1.6 gigatonne rise in carbon dioxide emissions, the highest ever recorded jump, the agency said. "This significant increase in Co_2 emissions and the locking in of future emissions due to infrastructure investments represent a serious setback to our hopes of limiting the global rise in temperature to no more than two degrees," said IEA Chief Economist, Fatih Birol. "Our latest estimates are another wake-up call," Birol said. "The world has edged incredibly close to the level of emissions that should not be reached until 2020 if the two degrees target is to be attained," he added. Scientists believe that a temperature rise of more than two degree Celsius would represent "dangerous climate change". The latest figures estimate that 30.6 Gt of carbon dioxide were emitted in 2010, a 5% jump from the previous record year in 2008. (*The Times of India,* Tuesday, May 31, 2011, Page 21)

دوسری طرف، رپورٹیں بتارہی ہیں کہ انسان کی صنعتی سرگرمیوں میں پچھلے سالوں میں کوئی کمی نہیں ہوئی ہے، بلکہ اس میں اضافہ ہوا ہے۔ اس کے نتیجے میں فضا میں کاربن کی مقدار مسلسل بڑھ رہی ہے۔ کاربن گیس کے فضا میں بڑھنے کا مطلب یہ ہے کہ گلوبل وارمنگ میں اضافہ ہو۔ گلوبل وارمنگ براہِ راست طور پر لائف سپورٹ سسٹم کو برباد کردینے والی ہے۔ مثلاً خالص ہوا نہ ملنے کی وجہ سے بیماری میں اضافہ، گلیشئر کی برف اور قطبین کی برف پگلنے کی بنا پر سمندروں کی سطحِ آب میں اضافہ اور اس طرح کے دوسرے مسائل انسانی زندگی کے لیے سخت تباہ کن ہیں۔ یہ واقعات موجودہ سیارہ ارض کو انسان کے لیے ناقابلِ رہائش (inhabitable) بنادینے والے ہیں۔

کچھ سائنس دانوں نے اِس خطرناک صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے یہ تجویز پیش کی ہے کہ جلد ہی زمین انسان کے لیے ناقابلِ رہائش ہوجائے گی، اِس لیے ہم کو چاہئے کہ ہم خلائی بستیاں (space colonies) بنائیں، تاکہ مستقبل میں انسان کی منتخب آبادی کو وہاں منتقل کیا جاسکے:

Unless humans colonize space within the next two centuries, they will become extinct, noted astrophysicist Stephen Hawking has warned adding, "Our only chance of long term survival is not to remain on planet Earth." In an interview with 'Big Think' portal, Hawking said he's an "optimist" but the next few hundred years had to be negotiated carefully if he human race is to survive. He said, "I see great danger for the human race. There have been a number of times in the past when survival has been a question of touch and go. The Cuban missile crisis in 1963 is one of these. "The frequency of such occasions is likely to increase in the future. We shall need great care and judgment to negotiate them all successfully. But I am an optimist. If we can avoid disaster for the next two centuries our species should be safe as we spread into space." Hawking has warned that mankind was entering "an increasingly dangerous period of our history". "Our population and use of the finite resources of planet Earth and growing exponentially along with our technical ability to change the environment for good and ill. "We have made remarkable progress in the last 100 years but if we want to continue beyond the next 100 years our future is in space," the Daily Mail quoted him as telling the portal. (*The Times of India,* August 10, 2010, p. 19)

مگر یہ ''خلائی بستیاں'' محض خیالی بستیاں ہیں، کیوں کہ اِس کا سرے سے کوئی امکان نہیں ہے کہ انسان اِس قسم کی خلائی بستیاں بنائے، جہاں لائف سپورٹ سسٹم کے تمام اسباب بشمول پانی موجود ہو اور انسان وہاں منتقل ہوجائے۔ ایسا ہونا کسی بھی درجے میں ممکن نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح انسان خود اپنی تخلیق نہیں کرسکتا، اِسی طرح وہ سیارۂ ارض کا کوئی متبادل سیارہ بھی تخلیق نہیں کرسکتا۔ اِس قسم کی باتیں محض شاعرانہ باتیں ہیں۔ اس سے زیادہ ان کی کوئی حقیقت نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ صورتِ حال بتا رہی ہے کہ اب اِس زمین پر انسان کی تاریخ بہت جلد ختم ہونے والی ہے، یعنی بہت جلد وہی واقعہ پیش آنے والا ہے جس کو مذہب کی زبان میں قیامت کہا جاتا ہے۔ عجیب بات ہے کہ موجودہ صورتِ حال میں کچھ لوگ یہ کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں کہ ابھی تو قیامت بہت دور ہے۔ ایسا کہنا صرف اپنے بارے میں غیر سنجیدگی کا ثبوت دینا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قیامت کی تمام نشانیاں ظاہر ہوچکی ہیں۔ اب اِس میں کوئی شبہہ نہیں رہا کہ قیامت بہت قریب آچکی ہے۔ ایسی حالت میں اصل کام یہ ہے کہ لوگ توبہ اور استغفار کریں، نہ کہ قیامت کو دور کی چیز سمجھ کر وہ اُس سے غافل بنے رہیں۔

دوسری طرف، جو لوگ خلائی بستی کی بات کر رہے ہیں، اُن کو چاہیے کہ وہ اس قسم کی خیالی باتوں میں اپنا وقت ضائع نہ کریں۔ وہ اِس معاملے میں اپنی سوچ پر نظر ثانی کریں۔ اگر وہ سنجیدگی کے ساتھ اِس معاملے پر غور کریں تو یقیناً وہ جان لیں گے کہ یہ معاملہ مذہبی تعبیر کے مطابق، ایک دورِ حیات کے خاتمہ اور دوسرے دورِ حیات کے آغاز کی خبر دے رہا ہے۔ انسانی زندگی کا یہ دوسرا دور وہی ہے جس کو جنت کہا جاتا ہے۔ موجودہ حالات اپنی خاموش زبان میں انسان کو یہ پیغام دے رہے ہیں کہ تمھارے لیے اب صرف ایک ہی آپشن باقی ہے، اور وہ جنت کا آپشن ہے:

Paradise is the only option for you.

ماہ نامہ الرسالہ اور مولانا وحید الدین خاں کی عصری اسلوب میں فکر انگیز کتابیں حسب ذیل پتہ پر دستیاب ہیں:

Rahbar Book Service
C-24, Shaheen Bagh, Thokar No. 8, Tayyib Masjid Road
Jamia Nagar, Okhla, New Delhi-110025
Mob.: 09810862382, 09716048296

تعلق باللہ

خدا کو ایک خارجی حقیقت کے طور پر دریافت کرنا کافی نہیں ہے۔ خدا کے ساتھ گہرا تعلق صرف اُس وقت قائم ہوتا ہے، جب کہ آدمی خدا کی رحمتوں کو اپنی ذات کی سطح پر دریافت کرے۔ اِس معاملے کو ایک لفظ میں پرسنلائزیشن آف بلسنگس آف گاڈ (personalization of divine blessings) کہا جاسکتا ہے۔ مثلاً ہر آدمی کو اپنے ماں باپ سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ کیوں کہ آدمی یہ سوچتا رہتا ہے کہ میرے ماں باپ نے میرے ساتھ یہ کیا اور میرے ماں باپ نے میرے ساتھ وہ کیا۔ اِس قسم کی سوچ جب خدا کے بارے میں پیدا ہوجائے تو اِسی کا نام تعلق باللہ ہے۔

موجودہ دنیا اپنے تمام اجزا کے ساتھ خدا کے انعامات کا ظہور ہے۔ سوچنے والے انسان کے لیے اُس کا ہر تجربہ اور ہر مشاہدہ خدا کے آفاقی انعامات کی یاد دلاتا ہے۔ یہ دریافت بھی کافی ہے کہ انسان خدا کو اپنا منعم سمجھے۔ وہ خدا کا شکر کرنے والا بندہ بن جائے، لیکن یہ احساس اُس وقت بہت زیادہ شدید ہوجاتا ہے جب کہ انسان اِن نعمتوں کو اپنی ذات کی سطح پر دریافت کرے۔ پہلی دریافت آدمی کو یہ الفاظ دیتی ہے کہ — خدایا، تو نے انسان کے اوپر کتنا زیادہ انعام فرمایا ہے۔ لیکن جب آدمی دوسری نوعیت کی دریافت کا تجربہ کرے تو وہ بے اختیار ہوکر پکار اٹھے گا کہ خدایا، تو میرے اوپر کتنا زیادہ مہربان ہے۔ تو نے مجھ کو وہ نعمتیں بھی دیں جن کو میں جانتا تھا، اس کے علاوہ تو نے مجھ کو مزید وہ بے شمار نعمتیں عطا کردیں جن کو میں نہ جانتا تھا اور نہ میں اُن کا طلب گار بن سکتا تھا۔

انسان سے سب سے زیادہ جو چیز مطلوب ہے، وہ اللہ سے گہرا تعلق ہے۔ یہ گہرا تعلق صرف گہری سوچ (deep thinking) کے ذریعے پیدا ہوسکتا ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ خدا کی نعمتوں کو اپنی ذات کی سطح پر دریافت کرے۔ اِس قسم کی ذاتی دریافت ہی کسی آدمی کے اندر گہرا تعلق باللہ پیدا کرسکتی ہے۔ خدا سے اِسی گہرے تعلق کو قرآن میں حبِّ شدید کہا گیا ہے: والذین آمنوا أشد حُبًّا للّٰہ (2: 165)۔

ایک غیر دانش مندانہ روش

حسن البصری (وفات: 110ھ) اور عمر بن عبدالعزیز (وفات: 101ھ دونوں ہم عصر تھے۔ عمر بن عبدالعزیز کے بارے میں تاریخی روایتوں میں آتا ہے کہ: **ولما ولی عمر بن عبد العزیز الخلافة کتب إلی الحسن البصري: إني قد ابتلیتُ بهذا الأمر، فانظر لي أعواناً یعینونني علیه۔ فأجابه الحسن: أما أبناء الدنیا فلا تریدهم، وأما أبناء الآخرة فلا یریدونك، فاستعن بالله۔** (الأعلام للزرکلي، جلد2، صفحہ 226)۔ یعنی جب عمر بن عبدالعزیز خلیفہ بنائے گئے تو انھوں نے حسن البصری کو خط لکھا۔ اُس خط میں یہ درج تھا کہ مجھ پر خلافت کی ذمہ داریاں ڈالی گئی ہیں، پس میرے لیے کچھ مددگار تلاش کیجئے جو اِس کام میں میری مدد کریں۔ حسن البصری نے اس کے جواب میں اُن کو لکھا— جہاں تک اہلِ دنیا کا تعلق ہے، آپ ان کو نہیں چاہیں گے اور جو اہلِ آخرت ہیں، وہ آپ کو نہیں چاہیں گے، اس لیے آپ اللہ سے مدد کے طالب بنئے۔

حسن البصری کا یہ جواب بلاشبہہ ان کے اخلاص پر مبنی تھا، لیکن یہ ایک غیر دانش مندانہ جواب تھا۔ اِس روش کا یہ نقصان ہوا کہ عمر بن عبدالعزیز کو اپنے زمانے کے علماءِ حق کا تعاون حاصل نہ ہوسکا۔ اصل یہ ہے کہ بعد کو جب مسلمانوں کے درمیان ملوکیت کا زمانہ آیا تو علماءِ حق نے ملوک سے دوری کا طریقہ اختیار کرلیا۔ یہ طریقہ بظاہر اخلاص اور تقویٰ پر مبنی تھا، لیکن وہ حکمت پر مبنی نہ تھا۔ کیوں کہ حکمراں کے پاس جو وسائل ہوتے ہیں، وہ افراد کے وسائل سے ہزار گنا زیادہ ہوتے ہیں۔

حکمت کا تقاضا ہے کہ اِن وسائل کو دین کے لیے استعمال کیا جائے۔ مگر مسلم علماء کے غیر ضروری احتیاط کی بنا پر یہ کام نہ ہوسکا۔ مسلمانوں کے پورے سیاسی عہد میں علماء کی عام طور پر یہی روش تھی۔ اِس عموم میں صرف چند علماء کا استثنا پایا جاتا ہے۔ مثلاً رجاء بن حیوہ الکندی (وفات: 112ھ) اور قاضی امام ابو یوسف البغدادی (وفات: 182ھ)۔ اِس غلط روایت کا نقصان قدیم تاریخ میں بھی ہوا اور جدید تاریخ میں بھی۔

گھر کی الٹی تربیت

میرے والد فرید الدین خاں کا انتقال دسمبر 1929 میں ہوا۔ اُس وقت میری عمر تقریباً 6 سال تھی۔ میرے والد اپنے تمام بچوں میں مجھ کو سب سے زیادہ مانتے تھے۔ وہ میرے ساتھ لاڈ پیار (pampering) کا معاملہ کرتے تھے۔ اِس بنا پر میں بہت شوخ ہوگیا تھا اور اکثر طفلانہ شرارتیں کیا کرتا تھا۔ شیخ محمد کامل میرے پھوپھا تھے۔ وہ اِس کو دیکھ کر غصہ ہوتے تھے۔ وہ میرے والد سے کہتے تھے کہ — تم اپنے بیٹے کو خراب کرڈالوگے۔

لیکن بچپن میں میرے والد کا انتقال ہوگیا۔ میری والدہ زیب النساء (وفات 1985) بتاتی تھیں کہ والد کی زندگی میں میں بہت بولتا تھا، لیکن جب والد کا انتقال ہوگیا تو اچانک میں بالکل بدل گیا۔ میری شوخیاں ختم ہوگئیں۔ اب میں خاموش رہنے لگا۔ یہ میری زندگی کا بہت بڑا واقعہ تھا۔ اگر میرے باپ زیادہ دن تک زندہ رہتے تو یقینی طور پر میں اُسی قسم کا ایک نوجوان بن جاتا جس کو لاڈ پیار سے بگڑا ہوا بچہ (spoilt and pampered child) کہا جاتا ہے۔ بعد کو میری زندگی میں جو حقیقت پسندی اور سنجیدگی آئی، وہ براہِ راست طور پر میری یتیمی کا نتیجہ تھی۔

ایک انسان جب پیدا ہوتا ہے تو ابتدائی طور پر وہ اپنے والدین کے ساتھ ہوتا ہے۔ لیکن یہ مدت عارضی ہوتی ہے۔ اس کو اپنی بقیہ زندگی والدین کے ماحول سے باہر، دوسروں کے درمیان گزارنی پڑتی ہے۔ والدین اپنے بچوں کے ساتھ لاڈ پیار کا معاملہ کرتے ہیں۔

اِس لاڈ پیار کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچہ شعوری یا غیر شعوری طور پر سمجھ لیتا ہے کہ مجھ سے محبت کرنے والا وہی ہے جو میرے ساتھ لاڈ پیار (pampering) کا معاملہ کرے۔ لیکن یہ بچہ جب اپنے گھر سے باہر آتا ہے تو دوسرے لوگوں سے اس کو والدین والا لاڈ پیار نہیں ملتا۔ اب وہ ساری دنیا سے بے زار ہوجاتا ہے۔ اِس صورتِ حال نے تمام عورتوں اور مردوں کو شکایت کی نفسیات میں مبتلا کردیا ہے، جب کہ صحیح یہ تھا کہ لوگوں کے اندر دوسرے انسانوں کے لیے محبت کی نفسیات پیدا ہو۔

زندگی کا سفر

انسان کی زندگی بہتے ہوئے دریا کی مانند ہے۔ دریا کیا ہے، دریا فطرت کا ایک انوکھا ظاہرہ ہے۔ دریا میں یہ ہوتا ہے کہ ہر لمحہ اس کے پرانے پانی میں نیا پانی شامل ہوتا رہتا ہے۔ اِس طرح دریا کی تازگی مسلسل باقی رہتی ہے۔ اگر کسی دریا میں پانی کا یہ تسلسل باقی نہ رہے تو ایسا دریا اپنی تازگی کو کھو دے گا، وہ اپنی صحت بخش صفت کو باقی نہ رکھ سکے گا۔

انسان کے بارے میں بھی فطرت نے یہی طریقہ رکھا ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے، انسان ایک نسلی تسلسل کا نام ہے۔ کچھ لوگ پیدا ہوتے ہیں، اُن کے ذریعے بچوں اور نوجوانوں کی ایک نئی نسل وجود میں آتی ہے۔ سو سال کے اندر پچھلے پیدا ہونے والے مر کر اِس دنیا سے چلے جاتے ہیں، اور ان کی جگہ نئے پیدا ہونے والے عورت اور مرد لے لیتے ہیں۔ دریا میں اگر پرانے پانی اور نئے پانی کا ریپلیس مینٹ (replacement) ہوتا ہے، تو انسان کے اندر یہی واقعہ پچھلی نسل اور اگلی نسل کے ریپلیس مینٹ کی صورت میں پیش آتا ہے۔

انسانی زندگی میں فطرت نے یہ جو نظام قائم کیا ہے، اس کے پیچھے بہت بڑی حکمت ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ اگلی نسل پچھلی نسل کے تجربات سے سبق حاصل کرے، وہ پچھلی نسل کے تجربات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی زندگی کا سفر زیادہ بہتر طور پر جاری رکھے۔ اگلی نسل کے لیے پچھلی نسل کا یہی وہ قیمتی عطیہ ہے جس کی بنا پر زیادہ عمر کے لوگوں کو اولڈ اِز گولڈ (old is gold) کہا جاتا ہے۔

مثلاً ایک بوڑھے باپ نے دیکھا کہ اس کا بیٹا بہت ذہین ہے، لیکن اس کے اندر مزاج کے اعتبار سے ایک قابلِ اصلاح چیز پائی جاتی ہے۔ وہ یہ کہ بیٹے کے اندر بہت بڑھی ہوئی خود اعتمادی ہے۔ اِس بڑھی ہوئی خود اعتمادی کی بنا پر اس کو کئی بار نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ باپ نے اپنے بیٹے کو سمجھایا اور کہا کہ کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ آدمی ہر حال میں حقیقت پسند بنے۔ اس نے اپنے بیٹے سے کہا:

My son, confidence is good, but over-confidence is equally bad.

یہ نصیحت بیٹے کو اس کی زندگی میں بہت کام آئی۔ اِسی طرح ایک بوڑھے باپ نے دیکھا کہ اس کے بیٹے کے اندر جلد بازی ہے۔ وہ صبر کے ساتھ انتظار کرنا نہیں جانتا۔ باپ نے بیٹے کو اپنے تجربات کے حوالے سے سمجھاتے ہوئے کہا:

My son, life is one percent action, and nintynine percent restraint.

باپ کی یہ نصیحت بیٹے کی زندگی کے لیے بہت مفید ثابت ہوئی۔

اِسی طرح ایک بوڑھے باپ نے دیکھا کہ اس کے بیٹے کے اندر استقلال نہیں ہے۔ وہ لوگوں کے ساتھ مل کر دیر تک کام نہیں کر پاتا۔ باپ نے اپنے تجربات کی روشنی میں بیٹے کو سمجھایا اور کہا:

My son, maturity is the ability to live
with things you can not change.

باپ کی یہ نصیحت بیٹے کے لیے ایک رہنما نصیحت بن گئی۔ اس نے اپنے معاملات پر نظر ثانی کی، اس نے اپنی زندگی کی ازسرِ نو پلاننگ کی اور پھر اس نے اپنی زندگی میں اعلیٰ کامیابی حاصل کی۔

اِن مثالوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگلی نسل کے لیے پچھلی نسل کتنی زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اگلی نسل کو پچھلی نسل دانش مندی عطا کرتی ہے۔ وہ اس کو ایسے فارمولے دیتی ہے جو عملی تجربات کے ذریعے صحیح ثابت ہو چکے ہیں۔ اِس طرح پچھلی نسل اگلی نسل کو اِس قابل بناتی ہے کہ وہ دوبارہ وہ غلطی نہ کرے جو پچھلے لوگوں نے کیا اور اس کا نقصان اٹھایا۔

حقیقت یہ ہے کہ اگلی نسل کے لیے پچھلی نسل فطرت کا ایک تحفہ ہے، ایسا تحفہ جس کا کوئی بدل نہیں، ایسا تحفہ جو کسی اور ذریعے سے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

انسان کی زندگی اگر رواں پانی کی طرح ہو، جس میں ہمیشہ پرانے پانی میں نیا پانی شامل ہوتا رہے، تو ایسا پانی ہمیشہ تر و تازہ رہے گا، وہ کبھی خراب نہ ہوگا۔ اِس کے برعکس، جو پانی بند گڑھے کی مانند ہو، اس میں نئے پانی کی آمیزش نہ ہوتی ہو تو ایسا پانی اپنی تازگی کھو دے گا، وہ غیر مفید بن کر رہ جائے گا— اِس معاملے میں بہتا ہوا دریا فطرت کی طرف سے ایک صحت بخش پیغام ہے اور انسانی تاریخ کا تجربہ اس کی عملی تصدیق کرتا ہے۔

آخری انجام

اورنگ زیب عالم گیر (وفات: 1707) کی بیٹی شہزادی زیب النساء بیگم (وفات: 1701) محل میں پیدا ہوئی۔ شاہانہ ماحول میں اس کی پرورش ہوئی۔ مگر آخر میں وہ بیمار ہوگئی۔ 62 سال کی عمر میں بعض تلخ تجربات کے بعد مایوسی کے عالم میں دہلی میں اس کی موت ہوئی۔ مرنے سے پہلے شہزادی نے اپنے مزار کے کتبہ کے لیے حسب ذیل فارسی شعر لکھا:

برمزارِ ما غریباں، نَے چراغے، نَے گلے　　　نَے پر پروانہ رقصد، نے صدائے بلبلے

یعنی مجھ غریب کی قبر پر نہ کوئی چراغ ہے اور نہ کوئی پھول۔ اِس لیے میرے مزار پر نہ کوئی پروانہ رقص کرتا ہے اور نہ کسی بلبل کی آواز سنائی دیتی ہے۔

موت اور آخری انجام کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ہر عورت اور مرد آخر کار اِسی قسم کے انجام سے دوچار ہوتے ہیں۔ ہر پیدا ہونے والے کے لیے آخر کار یہی مقدر ہے کہ وہ بے بسی کے عالم میں مرے اور ہمیشہ کے لیے اِس دنیا سے چلا جائے۔ یہ انجام ہر ایک کے لیے مقدر ہے، خواہ بظاہر وہ دولت واقتدار کے ماحول میں پیدا ہو یا غربت و بے کسی کے ماحول میں۔

کیا انسان اِسی لیے پیدا ہوا تھا کہ اِس طرح وہ ایک ناکام زندگی گزارے اور پھر وہ ہمیشہ کے لیے مٹ کر ختم ہو جائے۔ یہ تصور عقل کے بھی خلاف ہے اور فطرت کے بھی خلاف۔ حقیقت یہ ہے کہ زندگی کی معنویت (meaning) کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ موجودہ دنیا کو آخرت کی دنیا کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے۔ آخرت کی دنیا انسانی زندگی کو بامعنی بناتی ہے۔ آخرت کو مانے بغیر انسان کی زندگی سراسر بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ آخرت کا یہ تصور اپنے آپ میں اِس بات کا ثبوت ہے کہ آخرت کا تصور ایک حقیقی تصور ہے۔ وہ کوئی بے بنیاد مفروضہ نہیں۔ آخرت کو مانے بغیر موجودہ دنیا کی کوئی بامعنی توجیہہ ممکن نہیں۔ آخرت کا عقیدہ انسان کو ایک بامقصد نشانہ دے دیتا ہے۔ آخرت کو ماننے کے بعد، موت سے پہلے کی زندگی بھی بامعنی بن جاتی ہے اور موت کے بعد کی زندگی بھی بامعنیٰ۔

سوال وجواب

سوال

عصر حاضر کیا ہے، نیز کیا عصر حاضر کے بعض مظاہر مثلاً عریانیت، وغیرہ کی تردید، عصر حاضر کی تردید کے ہم معنی ہے۔ براہِ کرم، اس کی وضاحت فرمائیں (شارق حسین، نئی دہلی)

جواب

عصر حاضر کی ایک آئڈیالوجی (idealogy) ہے اور دوسری چیزیں وہ ہیں جو اس کے مظاہر ہیں۔ مظاہر ہمیشہ اضافی (relative) ہوتے ہیں، اِس لیے مظاہر کو دیکھ کر عصر حاضر کو درست طور پر سمجھا نہیں جاسکتا۔ عصر حاضر کی بنیاد اس کی مخصوص آئڈیالوجی پر ہے۔ عصر حاضر کو سمجھنے کے لیے اس کی اِسی آئڈیالوجی کو سمجھنا چاہیے۔

عصر حاضر کی آئڈیالوجی دراصل مذہب کی آئڈیالوجی کے بالمقابل پیدا ہوئی ہے۔ مذہب کی آئڈیالوجی تمام تر وحی (revelation) پر قائم ہے۔ الہامی مذاہب کی اصل بنیاد تمام تر وحی کا یہی تصور ہے۔ وحی کو مذاہب میں گویا کہ مسلمہ اصول (axiom) کا درجہ حاصل ہے، یعنی عقلی دلیل کے بغیر اس کو برحق تسلیم کرنا۔ یہی تمام الہامی مذاہب کی اصل بنیاد ہے۔

اِس کے مقابلے میں، عصر حاضر کی آئڈیالوجی عقل (reason) پر قائم ہے۔ اِس آئڈیالوجی کے مطابق، کسی بھی تصور کو مسلّمہ کی حیثیت حاصل نہیں۔ ہر تصور کو عقل کی معلوم کسوٹی پر جانچا جائے گا۔ جو چیز عقلی جانچ میں درست ثابت ہو، وہ درست ہے۔ اور جو چیز عقلی جانچ میں درست ثابت نہ ہو، وہ نادرست۔ یہی عصر حاضر کی اصل فکری بنیاد ہے۔

اِس مخصوص آئڈیالوجی کی بنا پر جدید ذہن نے عضویاتی ارتقا (organic evolution) کو حقیقت مان لیا۔ اِس کے مقابلے میں، اس نے خدا کے تصور کو مفروضہ قرار دیا۔ کیوں کہ عضویاتی ارتقا کم از کم اپنے طریقہ (method) کے اعتبار سے، جدید ذہن کو عقلی نظر آیا۔ اِس کے برعکس، خدا کے تصور کے بارے میں جدید ذہن کا خیال تھا کہ اس کے ثبوت کے لیے کوئی معلوم عقلی بنیاد موجود نہیں۔

عصر حاضر کی اِس آئڈیالوجی میں بلاشبہہ بہت سے علمی نقص موجود ہیں، لیکن عصر حاضر کا تجزیہ کرنے والوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ آئڈیالوجی اور مظاہر کے فرق کو سمجھیں۔ وہ یہ غلطی نہ کریں کہ مظاہر کی تردید کرکے وہ یہ سمجھ لیں کہ انھوں نے عصر حاضر کی آئڈیالوجی کو رد کر دیا۔

سوال

چند سوالات کی وضاحت مطلوب ہے — اسلام اور مسلمان دونوں کو ایک چیز سمجھا جائے یا ان میں کچھ فرق ہے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جذباتی اشو پر برطانیہ کے مسلمان بہت جلد بھڑ اٹھتے ہیں، اس کی وجہ کیا ہے۔ اسلام میں پردے کا تصور کیا ہے نیز کیا اسلام میں عورتوں پر مسجد جانے میں پابندی رکھی گئی ہے۔ کیا کارٹون جیسے معاملے پر بھڑکنا پیغمبر کی تعلیمات میں ہے (رنجنا سین گپتا، نئی دہلی)

جواب

1- جو آدمی اسلام کو سمجھنا چاہتا ہے، وہ اکثر ایک مسئلے سے دوچار رہتا ہے، وہ یہ کہ ایک طرف، اسلام کا اسکرپچر (scripture) قرآن ہے۔ اور دوسری طرف، مسلمان ہیں جو اسلام کو اپنا مذہب بتاتے ہیں۔ اِس طرح دو حوالوں کی بنا پر مطالعہ کرنے والا کنفیوژن میں پڑ جاتا ہے۔ وہ مسلمانوں کے عمل (practice) کو دیکھ کر اسلام کے بارے میں رائے قائم کرنے لگتا ہے۔ اِس معاملے میں یہ ایک عام غلطی ہے۔ اِس لیے اسلام کے اسٹوڈنٹ کے لیے پہلا رہنما اصول یہ ہے کہ:

You have to differentiate between Islam and Muslims. You have to judge Muslims in the light of Islamic teachings, and not vice versa.

اصل یہ ہے کہ اسلام ایک ریلیجس آئڈیالوجی ہے، جب کہ مسلمان ایک کمیونٹی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایسی حالت میں کمیونٹی کو اسلام کے تابع کیا جائے گا، نہ کہ اسلام کو کمیونٹی کے تابع کر دیا جائے۔

اسلام کے سائنٹفک مطالعے کے لیے یہ ایک بنیادی اصول ہے۔ اِس اصول کو ملحوظ رکھ کر ہی اسلام کے بارے میں درست رائے قائم کی جاسکتی ہے۔ اگر اِس اصول کو ملحوظ نہ رکھا جائے، تو اسلام کے بارے میں مبنی بر حقیقت رائے قائم کرنا ممکن نہیں۔

2- برطانیہ میں مقیم مسلمانوں اور دوسرے ملکوں کے مسلمانوں کے عقائد میں کوئی فرق نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اِس قسم کی جذباتیت کا سبب بنیادی طور پر صرف ایک ہے، اور وہ اردو زبان ہے۔ برطانیہ کے مسلمان زیادہ تر اردو اسپیکنگ علاقوں مثلاً انڈیا اور پاکستان سے آئے ہیں۔ موجودہ زمانے میں اردو زبان میں جو لٹریچر پیدا ہوا، بعض علاقائی سبب سے وہ زیادہ تر جذباتی اسلوب پر مبنی تھا۔ اردو زبان میں شاعری اور انشاپردازی اور خطابت کا بہت زیادہ رواج ہوا۔ اردو ماحول میں تربیت پائے ہوئے یہ لوگ بڑی تعداد میں برطانیہ گئے۔ مزید یہ کہ اس کے بعد ان کا رشتہ اردو اسپیکنگ علاقوں سے منقطع نہیں ہوا۔ اِس علاقے کے شاعر اور ادیب اور خطیب برابر وہاں جاتے رہے۔ اِس طرح برطانیہ میں اردو کلچر برابر فروغ پاتا رہا۔ زیادہ تر یہی اردو اسپیکنگ لوگ ہیں جو جذباتی اشو پر ہنگامہ کرتے رہتے ہیں۔ اِس قسم کے ہنگاموں کا، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے ادنیٰ درجے کا بھی کوئی تعلق نہیں۔

3- پردہ (veil) کی موجودہ صورت بعد کے زمانے میں ڈیولپ ہوئی۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں عورتوں کے لیے موجودہ قسم کے برقع کا وجود نہ تھا۔ عورتوں کے بارے میں اسلام کا جو اصول ہے، وہ بنیادی طور پر یہ ہے کہ اسلام مخلوط سوسائٹی (mixed society) کے خلاف ہے۔ اسلام اِس کو پسند نہیں کرتا کہ عورت اور مرد دونوں مچھلی کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ مخلوط ہو کر رہیں۔ اسلام کے مطابق، یہ بھی ایک غیر فطری بات ہے کہ عورت اور مرد دونوں کا ورک پلیس (work place) ایک ہو۔ اِسی طرح برہنگی (nudity) بھی اسلامی تعلیم کے مطابق، جائز نہیں۔

اِس معاملے میں اسلام کا جو اصول ہے، وہ یہ ہے کہ عورت اور مرد شادی شدہ زندگی گزاریں۔ عورت جب باہر نکلے تو سادگی کے ساتھ نکلے۔ وجہ اور کفّین کے سوا، اس کا پورا جسم ڈھیلے کپڑوں سے ڈھکا ہوا ہو۔ مسجد میں عورتوں کے جانے پر کوئی پابندی نہیں ہے، البتہ ڈسپلن کی خاطر یہ اصول مقرر کیا گیا ہے کہ با جماعت نماز میں عورتوں اور مردوں کی صفیں الگ الگ ہوں۔ عورت کے بارے میں اسلامی تعلیمات کا خلاصہ ایک لفظ میں یہ ہے:

Equal in respect, and different in role.

4- ڈنمارک کے ایک مقامی اخبار (*Jyllands Posten*) میں چھپنے والے کارٹون کو مسلمانوں نے جس طرح توہینِ رسول کا مسئلہ بنایا اور اُس پر شدید ہنگامے کیے، اُس کا کوئی بھی تعلق، اسلام سے نہ تھا۔ مذکورہ کارٹون کی حیثیت تو صرف ایک صحافتی جوک (joke) کی تھی۔ اِس قسم کا جوک موجودہ صحافت میں عام ہے۔ لیکن مسلمانوں نے اِس کے ردعمل میں جس طرح نفرت اور تشدد کا مظاہرہ کیا، وہ بلاشبہہ توہینِ رسول کا ایک فعل تھا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا مطالعہ بتاتا ہے کہ آپ کے زمانے میں بار بار اِس نوعیت کے واقعات ہوئے ہیں، لیکن آپ نے ان کے مقابلے میں صرف ایک روش کا اظہار کیا، اور وہ اِن واقعات کو نظر انداز کرنا تھا۔ چناں چہ میں نے ڈنمارک کے کارٹون کا واقعہ پیش آنے کے بعد ایک آرٹکل لکھا تھا، جو اُسی زمانے میں نئی دہلی کے انگریزی اخبار پائنئر (The Pioneer) کے شمارہ 2 مارچ 2006 میں درج ذیل عنوان کے تحت چھپا:

Muslims Must Ignore Cartoons

پیغمبر اسلام کی تعلیمات میں سے ایک تعلیم یہ ہے کہ ہر اُس اقدام سے بچو جس سے اسلام کی امیج خراب ہوتی ہو۔ موجودہ زمانہ آزادئ اظہارِ رائے (freedom of expression) کا زمانہ ہے۔ ایسے زمانے میں کارٹون جیسے مسئلہ پر ہنگامہ کھڑا کرنا، یقینی طور پر یہ تاثر پیدا کرے گا کہ اسلام آزادئ اظہارِ رائے کے خلاف ہے۔ ایسی حالت میں کارٹون جیسے مسائل پر ہنگامہ آرائی کرنا کسی بھی عذر کی بنا پر جائز نہیں ہوسکتا۔ اگر مسلمانوں کے جذبات مجروح ہوتے ہوں، تب بھی اُنھیں کامل اعراض سے کام لینا چاہئے۔ جذبات کا مجروح ہونا، اُن کے لیے اِس معاملے میں کوئی عذر نہیں بن سکتا۔

ماہنامہ الرسالہ کا انگریزی ایڈیشن حاصل کرنے کے لیے مندرجہ ذیل پتے پر رابطہ کریں:

The Spiritual Message
302, Koldongri CHS, Sahar Road
Andheri (East), Mumbai-400 099 (India)
Tel.: 022-42214700, Fax: 022-28236323
Email: spiritual.msg@gmail.com

خبرنامہ اسلامی مرکز— 212

1- کاشمیر دعوہ میٹ (فروری 2011) کے بعد کشمیر میں بڑے پیمانے پر دعوہ ورک شروع ہوگیا ہے۔ اس سلسلے میں 17-16 مئی 2011 کو سری نگر (کشمیر) میں جموں کشمیر پیس فاؤنڈیشن کی طرف سے ایک امن کانفرنس ہوئی۔ اِس کانفرنس میں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندو اور مسلم شخصیات نے شرکت کی۔ اِس موقع پر حاضرین کو دعوتی لٹریچر دیا گیا۔ خاص طور پر گورنر کشمیر مسٹر این این ووہرا، سوامی اگنی ویش، جی او سی روی تھوگڑے، اور پروفیسر رادھا کمار کو پرافٹ آف پیس اور قرآن کا انگریزی ترجمہ دیا گیا۔ اِس کو انھوں نے خوشی کے ساتھ قبول کیا۔

2- سہارن پور (یوپی) میں ہمارے ساتھی بڑے پیمانے پر دعوتی کام کررہے ہیں۔ اس کی رپورٹ حسب ذیل ہے:

پیس ہال میں 29 مئی 2011 کو ایک دعوتی اجتماع میں غیر مسلم بھائیوں کو قرآن کا ہندی اور انگریزی ترجمہ برائے مطالعہ دیا گیا۔ مسٹر اسوانی نے کہا کہ میں کافی دن سے مولانا وحید الدین خاں کی کتابیں پڑھ رہا ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ روحانیت کیا ہے، نیز اِس کا علم ہوا کہ آوا گون کا نظریہ ایک بے بنیاد نظریہ ہے۔

3- نیشنل میڈیکل کالج میں 5 جون 2011 کو اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونی ورسٹی کی ایک ٹیم آئی۔ اس موقع پر ٹیم کے لوگوں کو پرافٹ آف پیس اور قرآن کا انگریزی ترجمہ برائے مطالعہ دیا گیا۔ پروفیسر روساریہ نے کہا کہ ہم کسی مذہبی کتاب کو نہیں مانتے تھے، لیکن اگنو (IGNOU) میں ''اسلام اور آتنک واد'' کے موضوع پر مولانا وحید الدین خاں کی تقریر سننے کے بعد اب میرے دل میں قرآن اور پیغمبر اسلام کے بارے میں جاننے کا جذبہ پیدا ہوگیا ہے۔ اِس موقع پر پروفیسر ارورا نے خاص طور پر قرآن کا ہندی ترجمہ حاصل کیا۔

4- ہندی روزنامہ دینک جاگرن کی طرف سے 8 جون 2011 کو سہارن پور کے سب سے بڑے ہوٹل ''پنجاب'' میں ایک پروگرام ہوا۔ اِس پروگرام میں ڈاکٹر محمد اسلم خان کو بطور مہمان بلایا گیا تھا۔ سہارن پور کے دوسرے ہوٹلوں کی طرح، یہاں بھی سی پی ایس سہارن پور کے ساتھیوں نے قرآن کے اسٹینڈ رکھے تھے۔ لوگ یہاں سے قرآن کا ہندی اور انگریزی ترجمہ خرید کر حاصل کرتے ہیں۔ اِس کی شکل یہ ہے کہ قرآن کے ترجمے کا ایک نسخہ (copy) 50 روپئے کا ہوتا ہے۔ اِس میں سے 25 روپئے ہوٹل کا انتظامیہ لیتا ہے اور 25 روپئے سی پی ایس کے لوگوں کو واپس کردیتا ہے، تاکہ وہ قرآن کے مزید نسخے خرید کر وہاں رکھ سکیں۔ یہ ایک پریکٹکل طریقہ ہے۔ لیکن پنجاب ہوٹل کے مالک سردار سُرجیت سنگھ نے سی پی ایس کے لوگوں کو 50 روپئے کاپی کے حساب سے پیسے واپس کئے۔ جب اُن سے کہا گیا کہ آپ ہم کو صرف 25 روپئے کے حساب سے پیسے واپس کیجئے، 25 روپئے انتظامیہ کے لیے بطور نفع کاٹ لیجئے۔ اِس پر سردار سرجیت سنگھ اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہوگئے۔ انھوں نے انتہائی لجاجت کے ساتھ کہا کہ: ''جس اللہ نے ہم کو اتنی ساری نعمتیں دے رکھی ہیں، ہم اُس اللہ کی کتاب پر منافع لے کر

اس کی تجارت کریں، وہ ہم کو ہرگز معاف نہیں کرے گا۔ لہٰذا، اِس پیسے سے قرآن کے اور نسخے خرید کر اللہ کے بندوں تک پہنچایئے، تاکہ اُن کو روشنی ملے‘‘۔

5- نظام الدین ویسٹ ایسوسی ایشن (نئی دہلی) کے کمیونٹی سنٹر میں 10 جون 2011 کو ایک لائبریری قائم کی گئی ہے۔ اِس میں گڈ ورڈ بکس کی طرف سے صدر اسلامی مرکز کی اردو، ہندی اور انگریزی کتابوں کا ایک سیٹ رکھا گیا ہے۔

6- امریکا کے مختلف مقامات پر الرسالہ مشن کے تحت دعوتی کام ہو رہا ہے۔ اِس سلسلے میں حلقہ الرسالہ اور دیگر مقامی اداروں کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے امریکا کا سفر کیا۔ یہ سفر 14 جون 2011 سے 6 جولائی 2011 تک جاری رہا۔ اِس سفر میں سی پی ایس (نئی دہلی) کے 8 افراد شریک تھے۔ سفر کے دوران امریکا کے مختلف شہروں اور مختلف اداروں میں صدر اسلامی مرکز کا خطاب ہوا۔ یہ ایک دعوتی سفر تھا۔ اِس موقع پر بڑے پیمانے پر لوگوں کو قرآن کا انگریزی ترجمہ اور دعوتی لٹریچر دیا گیا۔ اِس سفر کی روداد ان شاء اللہ سفر نامے کے تحت الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

7- قرآن کا انگریزی ترجمہ اور دعوتی لٹریچر بڑے پیمانے پر غیر مسلموں کے درمیان پھیلایا جا رہا ہے۔ لوگ خوشی کے ساتھ اس کو قبول کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں یہاں اُن میں سے چند تاثرات نقل کئے جاتے ہیں:

- We are very interested in having the copies of translation of the Quran done by Maulana Wahiduddin Khan and look forward to hearing from you in this respect. (Hoda Shafiee Shakib, The International Quran News Agency, Tehran, Iran.)
- I traveled to Rev. Cliff's St. Paul's Episcopal Church in Philadelphia on 25th June, 2011 to hear Maulana Wahiduddin Khan and I must tell you that it was the most inspiring words I have heard. I would suggest going to the Center for Peace and Spirituality website for more information: www.cpsglobal.org. Maulana is preaching and teaching the peace of Islam to Muslims and countless others and literally changing the thinking of thousands of extremists. He is a remarkable holy scholar. (Larry, Pensylvania, USA)
- On 5th June, 2011, a dinner was hosted at the Taj Hotel in Mumbai where several well-known people of Mumbai including Ms. Nita Ambani were invited. This dinner was hosted by Mumbai-based Wadhwa Builders. Two of my acquaintances were also invited at the event. During dinner time, they shared the table with Ms. Nita Ambani. In the course of their discussion, they offered the English

translation of the Quran by Maulana Wahiduddin Khan to Ms. Ambani. She was delighted to receive it and said that it was the best gift she had ever received. In particular she mentioned that Mr. Ambani really appreciated the Maulana's views on the Babri Mosque verdict which was passed last year. She also said that Mr. Mukesh Ambani really admires the Maulana's views and they often read his articles. (Ramish Siddiqi, New Delhi)

- Dear Mr. Khan and friends at CPS International,Warm greetings to you heroes of the peace movement! My name is Thomas Davis, and I am a Christian minister from the US who loves Muslims and works for peace, and I would like to meet with you. I serve full-time with Peace Catalyst International, an organization with a very similar aim as CPS International. Having done a bit of research into your peacemaking work, I am very impressed and would be grateful for the chance to get to know CPS International and to learn more about what you do. I have much love and respect for the glorious Qur'an. Unfortunately, I do not read Arabic. I have numerous Engish translations, but yours is my favorite. While in Delhi, I plan to purchase a box of your Qur'ans to use in educating my Christian friends back in the US, most of whom have never picked up a copy of the Qur'an. (Thomas Davis, USA)

8 - صدر اسلامی مرکز کا اردو ترجمہ قرآن، مراٹھی زبان میں شائع ہوگیا ہے۔ قرآن کے اس مراٹھی ترجمے کو القرآن پبلیکیشنز، ناندیڑ، مہاراشٹر سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ موبائل نمبر یہ ہے: 09767172629

Islami Zindagi/Questions and Answers
by
Maulana Wahiduddin Khan
Zee Salaam
Daily 6.00 am, 6.30 pm

ISLAM FOR KIDS
by
Saniyasnain Khan / Maria Khan
ETV Urdu
Sunday 11.30 am
Friday 3.30 pm, Saturday 11.00 am

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر، مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

اللہ اکبر
اتحادِ ملّت
احیاءِ اسلام
اسباقِ تاریخ
اسفارِ ہند
اسلام: ایک تعارف
اسلام: ایک عظیم جدوجہد
اسلام اور عصرِ حاضر
اسلام پندرہویں صدی میں
اسلام دورِ جدید کا خالق
اسلام دینِ فطرت
اسلام کا تعارف
اسلام کیا ہے
اسلامی تعلیمات
اسلامی دعوت
اسلامی زندگی
اقوالِ حکمت
الاسلام
الربانیۃ
امنِ عالم
امہات المومنین
انسان اپنے آپ کو پہچان
انسان کی منزل
ایمانی طاقت
آخری سفر
باغِ جنت
پیغمبرِ اسلام
پیغمبرِ انقلاب
تذکیر القرآن
تاریخ دعوتِ حق
تاریخ کا سبق
تبلیغی تحریک
تجدید دین
تذکیۂ نفس
تصورِ ملت
تعارفِ اسلام
تعبیر کی غلطی
تعددِ ازواج
تعمیرِ انسانیت

تعمیرِ حیات
تعمیر کی طرف
تعمیرِ ملت
حدیثِ رسول
حقیقتِ حج
حقیقت کی تلاش
حل یہاں ہے
حیاتِ طیبہ
خاتونِ اسلام
خدا اور انسان
خلیج ڈائری
دعوتِ اسلام
دعوتِ حق
دینِ انسانیت
دینِ کامل
دین کی سیاسی تعبیر
دین کیا ہے
دینِ وشریعت
دینی تعلیم
ڈائری 84-1983
ڈائری 90-1989
ڈائری 92-1991
ڈائری 94-1993
رازِ حیات
راہِ عمل
راہیں بند نہیں
روشن مستقبل
رہنمائے حیات (کتابچہ)
رہنمائے حیات
زلزلہ قیامت
سبق آموز واقعات
سچا راستہ
سفرنامہ اسپین وفلسطین
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار، جلد اول)
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار، جلد دوم)
سوشلزم اور اسلام
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ
سیرتِ رسول
شتمِ رسول کا مسئلہ

صراطِ مستقیم
صوم رمضان
طلاق اسلام میں
ظہورِ اسلام
عظمتِ اسلام
عظمتِ صحابہ
عظمتِ قرآن
عظمتِ مومن
عقلیاتِ اسلام
علما اور دورِ جدید
عورت معمارِ انسانیت
فسادات کا مسئلہ
فکرِ اسلامی
کامیاب ازدواجی زندگی
قال اللہ وقال الرسول
قرآن کا مطلوب انسان
قیادت نامہ
قیامت کا الارم
کاروانِ ملت
کتابِ زندگی
کشمیر میں امن
مارکسزم: تاریخ جس کو رد کر چکی ہے
مذہب اور جدید چیلنج
مذہب اور سائنس
مسائلِ اجتہاد
مضامینِ اسلام
مطالعۂ حدیث
مطالعۂ سیرت (کتابچہ)
مطالعۂ سیرت
مطالعۂ قرآن
منزل کی طرف
مولانا مودودی، شخصیت اور تحریک
میوات کا سفر
نارِ جہنم
نشری تقریریں
ہندستان آزادی کے بعد
ہندستانی مسلمان
ہند-پاک ڈائری
یکساں سول کوڈ